شعبان المعظم۔ شوال المکرم ۱۴۳۳ھ
جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد ؒ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

(چھٹا ایڈیشن) ______ صفحات: 360، قیمت 450 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

(چوتھا ایڈیشن) ______ صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

(دوسرا ایڈیشن) ______ صفحات 331، قیمت 400 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

(پہلا ایڈیشن) ______ صفحات 394، قیمت 450 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

18-A ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۱ شمارہ ۳

شعبان المعظم۔ شوال المکرم ۱۴۳۳ھ لائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء

بیاد:
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ـــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید
نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل : publications@tanzeem.org
سالانہ زرِ تعاون : 200 روپے ، فی شمارہ : 50 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

اَسلاف سے الگ راہ......؟ حافظ عاطف وحید 3

حقیقتِ دین

عظمتِ صوم: حدیث قدسی کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ 13

مضامینِ قرآن

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ 26

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح افادات حافظ احمد یارؒ 40

دعوتِ عمل

خدمتِ قرآن کے میدان پروفیسر حافظ احمد یارؒ 53

علومِ قرآنی

اصولِ تفسیر القرآن بالقرآن: ایک مطالعہ نذیر احمد علائی 61

تعلیم و تعلّم

موجودہ درسی کتابوں کے نقائص ڈاکٹر محمد رفیع الدین 70

کتاب نما

تعارف وتبصرہ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ 76

ایجاد و ابداعِ عالم

THE PROCESS OF CREATION (iv) Dr. Israr Ahmad 87

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN Dr. Israr Ahmad 96

* * *

حرفِ اوّل

اَسلاف سے الگ راہ.....؟

رسول اللہ ﷺ کی مختلف امتیازی شانوں میں سے ایک شان ''رحمۃ لّلعالمین'' بھی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی ''وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ''۔ آپؐ کی اسی شانِ اَرفع کی نسبت سے آپؐ کی اُمّت ''اُمّتِ مرحوم'' کہلاتی ہے۔ اُمّت کے اس خوبصورت لقب کا تقاضائے اوّلین یہ ہے کہ امت کے افراد آپس میں رحمت اور محبت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہوں اور ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کی عملی تصویر ہوں۔

بدقسمتی سے امت کی مجموعی صورتحال اس حوالے سے خاصی دگرگوں نظر آتی ہے۔ خاص طور پر اگر معاملہ داعیان وخادمانِ دین کا ہو تو صورتحال بالکل ہی برعکس ہو جاتی ہے۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی لغزش یا ہلکی سے ہلکی اختلافی بات بھی نا قابلِ معافی متصوّر ہوتی ہے' اور ان کی جملہ خدمات کو اس اختلافی بات کے حوالے سے صفر سے ضرب دے دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر لگنے والے کسی ''الزام'' سے توبہ یا براءت کا واشگاف اعلان بھی کر دیں تب بھی مخالفین اس براءت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل کراچی سے کسی ملنے والے نے ایک معروف دینی مجلّہ* میں شائع ہونے والی ایک تحریر بعنوان ''اَسلاف سے الگ راہ'' ارسال کی اور پُر زور تقاضا کیا کہ اس کا جواب تحریر کیا جائے۔ اگرچہ ہماری عمومی پالیسی یہی ہے کہ ہم ایسی تنقیدوں اور فتووں کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں' لیکن اس تحریر کا جواب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ کراچی کے حلقے میں ایسے فتووں نے کچھ زیادہ ہی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں' جن کا ازالہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

اُس تحریر کے فاضل مؤلف نے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ (یعنی ڈاکٹر اسرار احمدؒ) سلف صالحین کے راستے پر نہیں ہیں —— اور اس ضمن میں انہوں نے تین اہم بنیادیں بیان کی ہیں (جبکہ بعض دیگر نکات ضمنی نوعیت کے ہیں) کہ جن کی رو سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی فکری پرواز خارجیت اور اعتزال پر مبنی ہے۔ مختصراً ان تین بنیادوں کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(ا) فاضل مصنف کے بیان کے مطابق ڈاکٹر اسرار احمدؒ اوّل و آخر مولانا مودودی صاحب کے پروردہ ہیں اور ان کی ذہنی اور فکری پرواز مودودی صاحب کی مرہونِ منت ہے' ماسوائے ان چند سیاسی امور کے جن میں ڈاکٹر صاحب کا اپنے ''مربی'' اور ''استاذِ اوّل'' سے اختلاف ہوا اور انہوں نے کھل کر ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر مودودی صاحب کے تضادات کو بیان فرمایا ہے اور اس کے بارے میں اپنی ناراضگی کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ لہٰذا صاحب مضمون کے الفاظ میں ''ڈاکٹر صاحبؒ چونکہ سید مودودیؒ کو اپنا فکری استاد گردانتے تھے لہٰذا ان کے بعض صحابہؓ کے بارے میں غیر معتدل

---

* ماہنامہ بیّنات' کراچی

افکار بھی ضرور ڈاکٹر صاحب میں سرایت کر گئے ہوں گے' اور چونکہ یہ افکار وخیالات عقیدۂ سلف صالح سے موافقت نہیں رکھتے لہٰذا اس کا حامل بھی لازماً راہِ سلف سے منحرف ہوگا۔"

(۲) ڈاکٹر اسرار احمدؒ باوجود اس کے کہ باقاعدہ عالم نہیں ہیں مگر وہ اپنے تئیں تقلیدِ شخصی کے قائل نہیں' بلکہ وہ اَسلافِ امت سے الگ راہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو نیم مقلّد قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس اصطلاح کو اَسلافِ امت کی نگاہ میں تلفیق کہا جاتا ہے اور تلفیق بین المذاہب باطل ہے۔

(۳) فاضل مصنف کے مطابق مولانا محمد یوسف بنوریؒ بھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے اَسلافِ امت کی راہ سے عدول وتجاوز اور تفسیری میدان میں ٹھوکر کھانے پر دکھ وکرب سے دوچار رہے اور انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب "انسان کا اصلی سرمایہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ سورۃ العصر کی تشریح میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا یہ کہنا کہ سورۃ العصر میں بیان کردہ لوازمِ نجات اصلاً کامیابی کے صرف آخری درجے میں پاس ہونے کا بیان ہے' فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں' لہٰذا اس اعتبار سے یہ سوچ مذہبِ خوارج اور معتزلہ کی فکر کے مطابق ہے۔

متذکرہ بالا امور کے جائزے سے پہلے ضروری ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کر لیا جائے کہ اہل علم کے لیے کسی غیر ہم مسلکی شخصیت پر نقد وجرح کے اصول' تقاضے اور طریقہ کار میں اور کسی ہم مسلکی شخصیت پر نقد وجرح کے طریقہ کار میں عموماً بہت تفاوت ہوتا ہے۔ غیر ہم مسلکی شخصیت کو گمراہ اور "خارج عن الملة" قرار دینے میں ہمیشہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جبکہ ہم مسلکی شخصیت کی بڑی بڑی علمی کوتاہیوں پر بھی عموماً نرم انداز میں اور تاویلات کا سہارا لیتے ہوئے علمی گرفت کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا تعارف بھی ظاہر ہے کہ مسلکِ دیوبند کی ایک "شخصیت" کے طور پر نہیں ہے بلکہ ان کا تعارف مسلکی اختلاف سے بالاتر ایک خادمِ دین اور خادمِ قرآن کی حیثیت سے معروف ہے۔ ان کی یہ حیثیت جہاں وسیع النظر حلقہ ہائے اہل علم کی نگاہ میں معتبر ہی نہیں قابلِ قدر بھی ہے وہیں پابندِ سلاسلِ مسلک حلقوں کی نگاہ میں یہی ان کی نااہلیت کی بنیاد بھی ہے۔ اس امر کا اظہار پورے طور پر "اسلاف سے الگ راہ" میں نمایاں ہو رہا ہے۔ اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریروں اور عبارتوں سے ایسے مفاہیم اور مطالب اخذ کیے گئے ہیں کہ جن کی طرف خود ڈاکٹر صاحب کا نہ تو اشارہ تھا اور نہ ہی ان کی مراد تھی۔ اور جہاں ان کی تحریروں میں سے فاضل مصنف کے اخذ کردہ معنی مراد لیے بھی جاسکتے ہیں وہاں ڈاکٹر صاحبؒ کی دیگر تصریحات اور توضیحات سے نہ صرف یکسر صرفِ نظر کیا گیا ہے بلکہ زبردستی ان پر ایسے الزامات تھوپے گئے ہیں جس سے ڈاکٹر صاحبؒ اوّل مرحلہ میں ہی اعلانِ براءت کر چکے ہیں۔

اب آیئے کہ ان تینوں الزامات کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔

ہم اپنی اس جوابی تحریر میں مذکورہ بالا مضمون کی پیش کردہ ترتیب کے برعکس ترتیب اختیار کریں گے تاکہ ڈاکٹر صاحبؒ پر عائد کردہ الزامات کی بہتر انداز میں وضاحت ہو سکے۔*

---

* آئندہ سطور کی تنقیح کے لیے ہمیں شعبۂ تدریس کے نوجوان اور باصلاحیت کارکن عزیزم مومن محمود کی معاونت حاصل رہی' جس کے لیے ہم عزیزم کے ممنونِ احسان ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم وفضل میں اضافہ فرمائے۔ آمین!

سورۃ العصر کی تشریح اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا اشکال

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وعظ اور فتویٰ کی عبارت اور انداز میں فرق ہوتا ہے۔ کسی واعظ کے وعظ اور کسی مقرر کی تقریر پر فقہی اور کلامی عینک لگانا چند وجوہ کی بنیاد پر درست نہیں۔ اس کی بعض وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مقرر موقع، مناسبت اور سننے والوں کی ذہنی سطح اور ایمانی گہرائی کے لحاظ سے اپنے کلام میں کسی خاص حوالے سے توجہ کو مرکوز کرواتا ہے اور اس ترکیزِ توجہ کا مقصد باقی پہلوؤں کا انکار نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص عمل صالح میں لوگوں کی کوتاہی کے ازالہ کے لیے کوئی وعظ کہتا ہے تو اس کے لیے اس مسئلے کے تمام فقہی پہلوؤں اور اعتقادی مباحث کا بیان اس کے وعظ کے اثر کو زائل کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ مثلاً ''فتوح الغیب'' میں شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کا خطاب بعض مواقع پر اتنا شدید ہے کہ پڑھنے والا یہ تاثر لیتا ہے کہ گویا شیخ صاحبؒ اپنے سامنے والوں کو منافق سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا ایسی عبارت سے موصوف کے عقیدہ پر استدلال کرنا درست ہوگا؟

(۲) کسی مصنف یا مقرر کی کسی ایک تحریر و تقریر سے اس کے عقیدہ کا استنباط علمی خیانت ہے جب تک اس کے موقف پر دلالت کرنے والی تمام تحریروں اور تقریروں کا بغور جائزہ نہ لے لیا جائے، اور اس ضمن میں بھی متشابہ کو محکم کی طرف لوٹانے کا اصول پیش نظر رکھا جائے گا۔

ان دو اصولوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی تحریر کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عبارت فقہی اور کلامی نہیں، اور بعض دوسرے موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے موقف کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ کی تالیف ''راہِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں'' کے بارے میں آپؒ کی کتاب ''حقیقت ایمان'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس کتابچے پر بعض بزرگوں نے گرفت فرمائی ہے کہ اس کی بعض عبارات سے عاصی اور گناہ گار اہلِ ایمان کے اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی پانے کی نفی ہوتی ہے۔ میں اس سے براءت کرتا ہوں۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نجات پا جائے گا۔ اس کتابچے میں جہاں جہاں لفظ نجات آیا ہے اس سے مراد ''اوّل مرحلے میں نجات'' ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو جہنم میں بالکل ڈالا ہی نہ جائے اور میدانِ حشر ہی میں رحمت و مغفرتِ خداوندی اس پر سایہ فگن ہو جائے۔ مزید برآں اس کتابچے کی زبان قانون اور فتوے کی نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب کی ہے، ورنہ میرا موقف بھی وہی ہے جو امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کا، یعنی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے!'' (ص ۹۹)*

---

* واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے کتابچے ''راہِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں'' کے کور پر متذکرہ بالا عبارت کی بالالتزام اشاعت کا اہتمام فرمایا تھا۔ فاضل مصنف نے مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے حوالے سے ''انسان کا اصلی سرمایہ'' کا جو حوالہ دیا ہے وہ ڈاکٹر صاحبؒ کی کوئی مستقل تالیف نہیں ہے، بلکہ اسی کتابچے کا ایک ذیلی عنوان ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی اس تصریح کے بعد کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں، کیونکہ متکلم کی اپنے کلام کی شرح ہی معتبر سمجھے جانے کے لائق ہے۔ اس محکم تصریح کے آ جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی ہر تقریر و تحریر کو اس کی طرف لوٹانا علمی دیانت کا اولین تقاضا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے لوگ ڈاکٹر صاحبؒ کی متعدد وضاحتوں کے باوجود بھی انہی اعتراضات کو دہراتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اپنے اکابرین کے بارے میں بسا اوقات ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ان کی بظاہر کفریہ عبارتوں کی بھی ایسی دور از کار تاویلات گھڑتے ہیں کہ شاید اگر ان کو وسعت دی جائے تو دنیا میں کفر کا وجود باقی نہ رہے، اور اللہ کا وہ بندہ جو اپنے موقف کی خود توضیح کر رہا ہے اس سے ایسا استغناء برتا جا رہا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

باقی رہا یہ معاملہ کہ کیا ڈاکٹر صاحبؒ ہی سورۃ العصر کی تفسیر میں ان سخت الفاظ کے خالق ہیں یا کبار مفسّرین بھی ان کے ہم نوا ہیں؟ اور کیا اگر یہ اعتراض ڈاکٹر صاحب پر وارد ہوتا ہے تو ان مفسرین پر بھی اسی طرح وارد ہوتا ہے؟ امام رازیؒ سورۃ العصر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> هذه الآية فيها وعيد شديد، وذالك لانه تعالى حكم بالخسار على جميع الناس الا من كان آتياً بهذه الاشياء الاربعة، وهى الايمان والعمل الصالح والتواصى بالحق والتواصى بالصبر، فدل ذالك على ان النجاة معلقة بمجموع هذه الامور وانه كما يلزم المكلف تحصيل ما يخص نفسه فكذالك يلزمه فى غيره امور منها الدعاء الى الدين والنصيحة والامر بالمعروف والنهى عن المنكر
>
> ''اس آیت میں شدید وعید ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے ان لوگوں کے جو یہ چار امور یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر انجام دیں، تمام انسانوں پر خسارہ کا حکم صادر فرمایا ہے اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ نجات ان چاروں امور کے مجموعے کے ساتھ معلّق ہے۔ چنانچہ ایک مکلّف کی جس طرح اپنے ذاتی حوالے سے ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دوسروں کے حوالے سے بھی اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، جیسے دعوت الی الدین، خیر خواہی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔''

کیا امام رازی اور ڈاکٹر صاحب کی عبارت میں نتائج کے اعتبار سے سرِ مُو فرق ہے؟ اگر کوئی کہے کہ امام رازی نے دوسرے مواقع پر اپنے موقف کی وضاحت کی ہے تو کیا ڈاکٹر صاحب نے نہیں کی؟

شیخ اسماعیل حقی البروسوی اپنی تفسیر ''روح البیان'' میں رقمطراز ہیں:

> فان المقصود بيان ما فيه الفوز بالحياة الابدية والسعادة السرمدية واشهادا بانما عداه يؤدى الى خسران ونقص
>
> ''کیونکہ اصل مقصود (سورۃ العصر کا) ان امور کا بیان ہے جس میں حیاتِ ابدیہ اور سعادتِ سرمدیہ مضمر ہے اور یہ باور کروانا ہے کہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ خسارہ اور نقصان کی طرف لے کر جاتا ہے۔''

علامہ ابن کثیر سورۃ العصر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> فاستثنى من جنس الانسان عن الخسران الذين امنوا بقلوبهم وعملوا الصلحت بجوارحهم (وتواصوا بالحق) وهو اداء الطاعات وترك المحرمات (وتواصوا بالصبر) اى على الاقدار۔

’’اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں سے خسارے کو صرف ان لوگوں سے دور کیا جو اپنے دل سے ایمان لاتے ہیں‘ جوارح سے عمل صالح انجام دیتے ہیں‘ اور حق بات یعنی اداءِ طاعات اور ترکِ محرمات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے ہیں‘ اور مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔‘‘

سوال یہ ہے کہ ابن کثیر نے اس موقع پر وہ تفصیل ذکر کیوں نہیں کی جو معترضین ڈاکٹر صاحب سے چاہتے ہیں؟

اسی طرح جمہور اہل سنّت (سوائے احناف) عمل کو ایمان کے مسمّٰی میں شامل سمجھتے ہیں‘ چنانچہ امام اشعریؒ ایمان کے بارے میں بارہ گمراہ فرقوں کے اقوال نقل کرنے کے بعد اہل سنت کا قول نقل فرماتے ہیں:

ویقرون بان الایمان قول وعمل یزید وینقص (مقالات اسلامیین)۔

’’اہلِ سنت اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ایمان قول وعمل کا نام جس میں اضافہ اور کمی ہوتی ہے۔‘‘

امام ابن تیمیہؒ نے فتاویٰ میں ان لوگوں کے رد میں جو عمل کو ایمان سے خارج سمجھتے ہیں‘ بہت عمدہ استدلال فرمایا ہے‘ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل دو ہیں‘ عمل قلب اور عمل جوارح۔ عمل قلب کے بغیر مجرد تصدیق اور اقرار نجات کے لیے کافی نہیں‘ کیونکہ تصدیق قلب اور اقرار لسانی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول سے بغض بھی رکھے تو کیا محض تصدیق اس کی نجات کے لیے کافی ہوگی؟ (تفصیل کے لیے فتاویٰ ابن تیمیہ‘ ج ۷)

شارح عقیدہ طحاویہ ابوالعز الحنفیؒ جمہور اہل سنت کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اختلف الناس فیما یقع علیه اسم الایمان کثیراً فذهب مالك والشافعي واحمد والاوزاعی واسحاق بن راهویه وسائر اهل الحدیث واهل المدینة واهل الظاهر وجماعة من المتکلمین: الی انه تصدیق بالجنان واقرار باللسان وعمل بالارکان

’’لوگوں نے ایمان کی تعریف پر اختلاف کیا ہے۔ امام مالک‘ شافعی‘ احمد‘ اوزاعی‘ اسحاق بن راہویہ‘ تمام محدثین‘ اہل مدینہ‘ اہل ظاہر اور متکلمین کی ایک جماعت کے مطابق ایمان دل سے تصدیق‘ زبان سے اقرار اور جوارح سے عمل کا نام ہے۔‘‘

چنانچہ عمل کو نجات کے لیے بالکل بے معنی بتانا کہاں تک اہل سنت کا متفقہ قول ہے؟

امام برہان الدین بقاعیؒ بھی صراحتاً فرماتے ہیں کہ جب تک انسان اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے اس سے مطلق خسر دور نہیں ہوتا۔

ولما کان الانسان بعد کماله فی نفسه بالاعمال لاینتفی عنه مطلق الخسر الا بتکمیل غیره۔

’’انسان جب تک دوسروں کی اصلاح کی کوشش نہ کرے اس سے مکمل خسارہ دور نہیں ہوتا۔‘‘

ان اقوال کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی سورۃ العصر کے ضمن میں تصریحات اکابر مفسرین کے قول کے موافق ہی ہیں۔ ’’اسلاف سے الگ راہ‘‘ کے فاضل مصنف اگر خود بھی اس سورت کی تفسیر بیان کریں گے تو انہیں بھی ان چاروں امور کو لازمی بتانے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ البتہ اگر اوّل مرحلہ میں ہی یہ طے کرلیا جائے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر‘ معاذ اللہ‘ خارجیت اور اعتزال پر مبنی ہے تو ظاہر ہے کہ اس اندازِ فکر کا کوئی علاج نہیں۔

کیا ڈاکٹر صاحبؒ اوّل و آخر مولانا مودودیؒ کے پروردہ ہیں؟

جہاں تک اس دوسرے الزام کا تعلق ہے کہ:

> ''ڈاکٹر صاحب چونکہ سید مودودی کو اپنا فکری استاد گردانتے تھے لہٰذا ان کے بعض صحابہؓ کے بارے میں غیر معتدل افکار بھی ضرور ڈاکٹر صاحب میں سرایت کر گئے ہوں گے' اور چونکہ یہ افکار و خیالات عقیدۂ سلف صالح سے موافقت نہیں رکھتے لہٰذا اس کا حامل بھی لازماً راہِ سلف سے منحرف ہوگا۔''

تو یہ بھی ایک بہتان ہی ہے' اس لیے کہ اگر اس منطقی تانے بانے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ہر ایرے غیرے پر واضح ہوتی ہے کہ یہ استدلال' علمی اور اخلاقی ہر دو اعتبار سے باطل ہے۔ ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ کیا کسی شخص کو اپنا فکری استاد قرار دینے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی ہر فکری و اعتقادی رائے کو من و عن تسلیم کیا جائے؟ اور اگر یہاں منطقی لزوم نہیں (جو کہ صاحب الزام پر واضح ہے) تو استاد کی فکر سے شاگرد کے خیالات پر دلیل قائم کرنا کہاں تک علمی و اخلاقی رویہ ہے؟ کیا امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ہر رائے کو صاحبین کی رائے قرار دینا درست ہے؟ کیا ابن تیمیہؒ کے تفردات کو ابن کثیرؒ اور ذہبیؒ کی فکری بنیاد قرار دینا منطقی طور پر صائب ہے؟ ہمیں حیرت ہے کہ اس قسم کے استدلالات کا مصدر وہ مقدس درس گاہیں ہیں جہاں منطق کو گھول کر پلایا جاتا ہے۔

جہاں تک اس استدلال کی اخلاقی کمزوری کا تعلق ہے تو یہ منطقی کمزوری سے بھی زیادہ مہیب ہے' کیونکہ ایک بندۂ مؤمن دماغی منطق سے زیادہ قلبی منطق (اخلاق) پر عمل پیرا ہوتا ہے اور یہ قلبی منطق ہمیشہ اس کی وجودی ترکیب میں دماغ پر غلبہ رکھتی ہے۔ اسی لیے علمائے اخلاق (صوفیاء) فرماتے ہیں اور ان کا یہ جملہ آبِ زر سے مرقوم ہونے کے قابل ہے کہ ''اگر حسن ظن کی ایک دلیل ہو اور سوءِ ظن کی ننانوے تو اس ایک کو سو پر ترجیح دو۔''

اگر ہمارے اہل علم صرف ایک اس قاعدے ہی کو حرزِ جان بنالیں تو ہمیں یقین ہے کہ بہت سی بدگمانیاں ختم ہو جائیں۔ ہمارا ان اہل علم سے صرف ایک مؤدبانہ سوال ہے کہ کیا ڈاکٹر صاحبؒ کے خلاف فتویٰ دینے سے پہلے انہوں نے اس تکلیف کو گوارا کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے مراسلہ ہی کے ذریعے پوچھ لیتے کہ کیا وہ اپنے فکری استاد کے فلاں موقف پر قائم ہیں؟ اور کیا ایسا کرنا دینی لحاظ سے واجب نہیں تھا؟ اور کیا محض غیر منطقی استدلال اور غیر اخلاقی رویہ فتویٰ کی بنیاد بن سکتا ہے؟ کیا یہ فتویٰ بہتان نہیں؟ کیا اس قسم کی الزام تراشی کے بعد ان اہل علم کے اقوال و افعال پر اعتماد باقی رہ سکتا ہے؟ کیا اخلاقی اصول کتبِ تصوف کی زینت اور مجالسِ وعظ میں لوگوں کو رلانے کے لیے رہ گئے ہیں؟

یہ اس استدلال کا صرف ایک نظری جائزہ تھا۔ جہاں تک محسوس حقائق کا تعلق ہے تو اس ضمن میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ میں سید مودودیؒ کا مقلدِ محض ہوں اور ان کی ہر رائے کو من و عن تسلیم کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحبؒ دین کے حرکی اور انقلابی تصور کے بارے میں برملا فرمایا کرتے تھے کہ اس ضمن میں ان کے فکری استاد ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ اقامتِ دین کی فرضیت اور اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کی اہمیت و ضرورت' یہ وہ تصورات ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے سید مودودیؒ سے اخذ کیے ہیں' اور صرف اسی حوالے سے وہ ان کو اپنا مرشد قرار دیتے تھے۔ اور جہاں تک ان مسائل کی فروعات کا تعلق

ہے تو سب جانتے ہیں کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے طریقہ کار کے بارے میں دونوں ہستیوں میں شدید اختلاف تھا اور یہی اختلاف ڈاکٹر صاحب کی جماعت سے علیحدگی کا باعث بنا۔ گویا جس معاملے میں ڈاکٹر صاحب برملا مودودی صاحب کے متبع ہیں اس میں بھی ان کا اختلاف ثابت ہے تو کیا دوسرے مسائل میں اختلاف منطقی اور بالاولیٰ نہیں؟

آخر میں اس مسئلے کو مزید ٹھوس (substantial) بنانے کے لیے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اپنی متعدد تقاریر میں سید مودودی رحمہ اللہ کی ان عبارات سے جو شانِ صحابہؓ کے موافق نہیں، اعلانِ براءت فرما چکے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے دروس کو مستقل سننے والے اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحبؒ کے متعدد خطابات اور نجی محافل میں اس معاملے کا ذکر ملتا ہے، تاہم نمونے کے طور پر ذیل میں ڈاکٹر صاحبؒ کی تقریر کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ اس معاملے میں مولانا مودودیؒ کے مؤید نہیں تھے بلکہ اسے ان کی غلطی گردانتے تھے۔

دورِ خلافت حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ

> ''.....البتہ اہل سنت میں بھی ایک فرق و تفاوت ہے جو کافی عرصے سے چلا آ رہا تھا، لیکن بعض وجوہات اور اسباب کی بنا پر اس دور میں آ کر اس کا ظہور شدت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اہلِ سنت کا معاملہ تو یہ ہے کہ انہیں جتنا پیار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہے اتنا ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی پیار ہے، اس میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا ان کا معاملہ یہ رہا ہے کہ جو باتیں بھی حضرت علیؓ کی فضیلت و منقبت کے سلسلے میں بیان ہوئیں انہوں نے سب کو ذہناً قبول کیا اور مقابلے میں اگر کوئی چیزیں آئی ہیں جن میں کہ حضرت علیؓ پر بھی کوئی تنقید کی بات آتی ہو تو اس کو انہوں نے ذہناً قبول نہیں کیا۔ اس پہلو سے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اہلِ سنت کے عوام اور جہلاء میں بھی اکثر و بیشتر وہی خیالات اس شدت کے ساتھ نہ سہی لیکن اس سے کم تر شدت کے ساتھ پھیلتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرات امیر معاویہ، عمرو بن العاص، ابوموسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ، اور یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی شکوک و شبہات اور طرح طرح کی باتیں ذہنوں میں جڑ پکڑتی چلی گئیں۔ اس لیے کہ معاملہ یک طرفہ رہا ہے۔ اس یک طرفہ معاملہ کی وجہ سے چونکہ جواباً کوئی حملہ نہیں تھا اہل سنت کی طرف سے ائمہ اہل بیت پر یا حضرت علی، حضرت حسین یا حضرت حسن رضی اللہ عنہم پر تو نتیجہ اس کا یہی نکلنا چاہیے تھا کہ اس کا جو اثر پڑا ہے لوگوں کے ذہنوں میں بدگمانیاں، شکوک و شبہات جو ہیں ایسے بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے بارے میں جڑ پکڑ گئیں، یہاں تک کہ بہت سے حضرات اہل سنت میں سے ان کی شان میں گستاخی کر بیٹھتے ہیں، ان کی نیتوں پر حملے کرتے ہیں، ان کے لیے وہ الفاظ استعمال کر بیٹھتے ہیں کہ جو عام دنیادارانہ سیاست میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ چال بازی، ہوشیاری، دغا بازی، یہ ساری چیزیں، لوگوں کے دین و ایمان کو دولت سے خرید لینا، لوگوں کو اس طرح کے ....اور یہ چیزیں جو ہیں بظاہر وہ لوگ کہ جو اپنے آپ کو اہل سنت کہتے ہیں ان کی زبانوں پر بھی آ جاتی ہیں........ دوسرا بڑا سبب یہ ہوا کہ مولانا مودودی نے جو ایک کتاب لکھی ''خلافت و ملوکیت'' کے عنوان سے اپنے موضوع کے اعتبار سے، وہ ان کی اپنی تحقیق ہے، لیکن یہ کہ اس میں بعض چیزیں ایسی

> آ گئی ہیں کہ جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں وہی کیفیت جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا ایک شدید ردِّعمل ہوا ہے اہلِ سنت میں اور بے شمار کتابیں ہیں جو پھر اس کے جواب میں آئیں۔ ان میں مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب بھی ہے' ان میں مولانا صلاح الدین یوسف صاحب کی کتاب بھی ہے۔ بے شمار کتابیں آئی ہیں اور یہ موضوع اب ہمارے ہاں نکھر کر آ گیا ہے۔''
>
> (AU-10-20 کیسٹ نمبر 3)

مندرجہ بالا اقتباس اس امر پر واضح اور بین ثبوت ہے کہ فاضل مصنف نے محض سوئے ظن قائم کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ''...لہٰذا ان (یعنی مولانا مودودیؒ) کے بعض صحابہؓ کے بارے میں غیر معتدل افکار بھی ضرور ڈاکٹر صاحب میں سرایت کر گئے ہوں گے' اور چونکہ یہ افکار وخیالات عقیدۂ سلف صالح سے موافقت نہیں رکھتے لہٰذا اس کا حامل بھی لازماً راہِ سلف سے منحرف ہوگا''۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک نہیں متعدد مواقع پر ''خلافت وملوکیت'' میں اختیار کردہ اس غیر معتدل اندازِ فکر پر حسبِ موقع صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ اور مسئلہ تقلید

جہاں تک مسئلہ تقلید کا تعلق ہے تو یہ کہنا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ باوجود اس کے کہ باقاعدہ عالم نہیں ہیں مگر وہ اپنے تئیں تقلیدِ شخصی کے قائل نہیں' بلکہ وہ اَسلافِ امت سے الگ راہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو نیم مقلد قرار دیتے ہیں... ڈاکٹر صاحب کی اس اصطلاح کو اسلافِ امت نگاہ میں تلفیق کہا جاتا ہے اور تلفیق بین المذاہب باطل ہے... لہٰذا ڈاکٹر صاحبؒ اس قول میں سلف کی راہ سے الگ کھڑے ہیں--- ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت کے غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے:

> ''میں نے اس کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ میں اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کر رہا ہوں' چونکہ بات سمجھانے کے لیے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑتی ہیں۔ اصلاً یہ اصطلاح میں نے اپنے فقہی موقف کے لیے وضع کی ہے۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ میں مقلد ہوں پانچ کا' صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہلِ سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں اور پانچویں امام بخاریؒ جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ ''اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ''۔ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لیے عافیت سمجھتا ہوں''۔ (ماہنامہ ''میثاق'' ستمبر 1984ء' ص:50)

(ا) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے اس قول کے پس منظر کو سمجھا جائے۔ ائمہ اربعہ کے دائرے میں اپنے آپ کو محدود رکھنے کا مقصد ہوئ پرستی اور اُن باطل رجحانات کا انکار ہے جن کے حاملین اجتہاد کے نام پر دین کے ثوابت ومتغیرات ہر دو اقسام پر اپنی ناقص عقل ومنطق کے گھوڑے دوڑانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ اصلاً اس گروہ سے اعلانِ بیزاری فرما رہے ہیں اور وہ اپنے لیے ایک سرخ لکیر (red line) مقرر فرما رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قول کا قطعی طور پر یہ مطلب نہیں کہ وہ ان مذاہبِ اربعہ کے درمیان آزادانہ ''آوارہ گردی'' اور محض خواہش نفس کی بنیاد پر احکام میں ردّ وقبول کا ارادہ رکھتے ہیں' اور نہ ہی ان کی پوری زندگی اس تفسیر کی اجازت دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قول کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

کے اس قول کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے جس کا وہ بار ہا اپنی تقاریر میں حوالہ دیا کرتے تھے:

ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة ' او من يعتد به منها على جواز تقليد بها الى يومنا بهذا وفى ذالك من المصالح ما لا يخفى (حجة اللّٰه البالغة)

''امت مسلمہ اور ان کے سرکردہ علماء کا ان چاروں مدوّن ومنقّح مذاہب کی تقلید پر اجماع واقع ہو چکا ہے اور اس (تقلید) میں بکثرت مصالح موجود ہیں جو مخفی نہیں۔''

اسی طرح ''عقدالجید'' میں فرماتے ہیں:

اعلم ان فى الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفى الاعراض عنها كلها مفسدة عظيمة

''جان لو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار میں عظیم مصلحت ہے اور ان سے اعراض میں شدید مفسدہ ہے۔''

ڈاکٹر صاحبؒ شاہ ولی اللہؒ کے انہی اقوال کو اپنے لیے مشعل راہ اور دین میں باطل رجحانات کے سدباب کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(۲) دوسری گزارش یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی عبارت سے ''تقلید غیر شخصی'' کا تو ثبوت ملتا ہے لیکن تلفیق کا دور دور تک ثبوت نہیں۔ یہ بات ہر صاحب علم جانتا ہے کہ تقلید غیر شخصی تلفیق کو مستلزم نہیں جو بالاجماع فقہاء ناجائز ہے۔ تلفیق اصلاً ایک ہی مسئلہ میں دو فقہاء کے اقوال کو اس طریقہ پر جمع کرنا ہے کہ وہ مسئلہ دونوں فقہاء کے ہاں باطل قرار پائے۔ مولانا تقی عثمانی اپنی نئی طبع شدہ کتاب ''**اصول الافتاء وآدابه**'' میں ''**حكم التلفيق**'' کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

الذى تلخص لى فى موضوع التلفيق ان هذا الاصطلاح يقصد به فى عامة كلام الفقهاء ان يختار مذهبان فى مسئلة واحدة بحيث تحدث منه حالة مركبة لا تجوز فى احد المذهبين' مثل ان يأخذ المرء بقول الحنفية فى عدم انتقاض الوضوء بلمس المرأة وبمذهب الشافعية فى عدمه بالدم السائل ويصلى بعد ما مس امرأة وسال منه دم فان هذه الصلوة لا تصح فى احد من المذهبين

''تلفیق کے موضوع پر میرے سامنے ایک بات آئی ہے' وہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح فقہاء کے عمومی کلام میں یہ معنی رکھتی ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں دو مذہب اس طور پر اختیار کیے جائیں کہ ایک ایسی مرکب حالت کا وجود ہو جائے جو دونوں مذاہب میں جائز نہ ہو' مثلاً یہ کہ کوئی شخص عورت کو (شہوت کے ساتھ) ہاتھ لگانے میں وضو نہ ٹوٹنے کا مسئلہ تو حنفیہ سے لے اور خون نکلنے سے وضو نہ ٹوٹنے کا مسئلہ شافعیہ سے اور پھر عورت کو چھونے اور خون نکلنے کے بعد نماز پڑھے تو یہ نماز دونوں مذاہب میں جائز نہیں۔''

معلوم ہوا کہ محض دو الگ مسائل میں دو مذاہب کا اختیار کرنا تلفیق نہیں۔ چنانچہ تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

وكذالك وقع فى كتابات عدة من اهل العلم نسبة جواز التلفيق الى ابن الهمام وابن امير حاج ولكن يتبين بمراجعة نصوصها فى التحرير وشرحه انها لم يؤيدا جوازه وانما جوزا تقليد مذهب اخر بشرط عدم التلفيق

''بعض اہلِ علم کی کتب میں ابن الہمام اور ابن امیر حاج کی طرف تلفیق کے جواز کی نسبت پائی جاتی ہے لیکن ''تحریر'' اور اس کی شرح میں ان کے اقوال کے تتبع سے یہ بات واضح ہوتی ہے انہوں نے کسی دوسرے مذہب کی تقلید کے جواز کا فتویٰ دیا ہے بشرطیکہ تلفیق نہ ہو۔''

چنانچہ عدم تقلید شخصی کی تین صورتیں ممکن ہیں:

(۱) تلفیق (جس کا ذکر ہو چکا)

(۲) ایک ہی مسئلے میں دو اقوال کو ایسے جمع کرنا کہ ایسی حقیقت مرکبہ کا وجود لازم نہ آئے جو دونوں مذاہب میں جائز نہ ہو۔

(۳) الگ الگ مسائل میں الگ الگ ائمہ کے اقوال کو اختیار کرنا۔

پہلی صورت جائز نہیں اور بقیہ دونوں اشکال مختلف فیہ ہیں' بشرطیکہ محض ہوائے نفس کی بنیاد پر ردوقبول مقصود نہ ہو۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی ذکر کردہ عبارت سے پہلی صورت (تلفیق) مراد لینا کسی صورت بھی درست نہیں۔ ہاں' اس عبارت کے ظاہر سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ عدم تقلید شخصی کے قائل تھے اور اس میں بھی ان کی مراد دلیل کا اتباع تھا نہ کہ بر بنائے خواہش نفس مختلف مذاہب کو اختیار کرنا۔ تقلید شخصی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحبؒ کے اس تبصرے اور اندازِ فکر کی بنا پر انہیں سلف کی راہ سے منقطع قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ بہرحال اس میں اُمت کے اکابرین کا اختلاف ثابت ہے۔ ابن ہمام اور ابن امیر حاج کا ذکر تو آ چکا' اسی طرح ابن تیمیہ' ابن قیم' امام شاطبی رحمہم اللہ وغیرہ بھی تقلید شخصی کے قائل نہیں تھے۔ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تقلید شخصی کا حکم صرف سدِ ذریعہ کے طور پر ہے نہ کہ نصوص سے مستنبط۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ''سو ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ واجب نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترکِ تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے۔'' (خطبات حکیم الامت' جلد ٦)

مزید فرماتے ہیں:

> ''اسی واسطے تقلید غیر شخصی کو فقہاء نے کتابوں میں منع لکھا ہے' مگر جو عالم غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو اور نہ اس کے سبب عوام میں ہیجان ہو' اس کو تقلید غیر شخصی بھی جائز ہو گی۔'' (بحوالہ اصول الافتاء وآدابہ)۔

جدید دور میں بھی بہت سے مستند فقہاء نے تقلید غیر شخصی کو جائز قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ڈاکٹر وھبہ الزحیلی کی کتاب ''اصول الفقہ الاسلامی'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

علماء کی ان تصریحات کی روشنی میں ڈاکٹر صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت اور ڈاکٹر صاحبؒ کی زندگی سے ان کے عمل کی شہادت اس بات کی غماز ہے کہ اُن کا اپنے بارے میں نیم مقلد کی اصطلاح کا مطلب یہ لینا کہ ''عام آدمی کا مختلف ائمہ سے اپنی سہولت کے لیے رخصتوں کا تلاش کرنا اور کسی ایک فقہ کا پابند نہ ہونا تلفیق کہلاتا ہے اور تلفیق بین المذاہب باطل ہے'' فاضل مصنف کا اپنا طبع زاد ہے اور اس کا ڈاکٹر صاحبؒ سے کوئی تعلق نہیں۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ تقلید غیر شخصی کا option ڈاکٹر صاحب کے لیے اس لیے موجود نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ ''باقاعدہ'' عالم دین نہیں ہیں' تو یہ اعتراض بھی محل نظر ہے۔ اس لیے کہ ''باقاعدہ'' سے اگر تو یہ مراد ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی ''دیوبندی'' مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں تو یہ بات اس حد تک تو درست ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا

(بقیہ صفحہ 25 پر)

عظمتِ صوم

حدیثِ قُدسی "فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اَلصَّوْمُ لِیْ

جملہ عباداتِ اسلامی —— صلوٰۃ و زکوٰۃ اور صوم و حج —— میں سے عبادتِ صوم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں متعدد روایات کی رُو سے، جن میں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت بھی شامل ہے، ایک حدیثِ قُدسی میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ))(۱)

''روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔''

جنہیں بعض لوگوں نے اعراب کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوں بھی پڑھا ہے کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ))

''روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں!''

---

(۱) روزہ کے بارے میں حدیث قدسی کے مندرجہ بالا الفاظ متفق علیہ ہیں، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهٗ اِلَّا الصِّیَامَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ......))

(۲) صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں حسب ذیل الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((یَتْرُكُ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ وَشَهْوَتَهٗ مِنْ اَجْلِیْ ، اَلصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ......))

(۳) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ یُضَاعَفُ : اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ، یَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ......))

(بحوالہ ریاض الصالحین ، للامام النووی)

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نماز اللہ کے لیے نہیں؟ اسی طرح کیا زکوٰۃ اور حج اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب صرف نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے واضح ارشادات ہیں:

١۔ ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (١٤)﴾ (طٰہٰ)
”اور قائم کر نماز میری یاد کے لیے!“

٢۔ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (٢٣٨)﴾ (البقرۃ)
”محافظت کرو نمازوں کی اور خاص طور پر نماز وسطیٰ کی‘ اور کھڑے رہو اللہ کے لیے پوری فرمانبرداری کے ساتھ!“

٣۔ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ﴾ (ال عمران: ٩٧)
”اور لوگوں کے ذمّے ہے اللہ کے لیے حج بیت اللہ‘ جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔“

٤۔ ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ١٩٦)
”اور پورا کرو حج اور عمرے کو اللہ کے لیے۔“

٥۔ ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (٩)﴾ (الدھر)
”ہم کھانا کھلاتے ہیں تمہیں صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے‘ اور تم سے طالب ہیں نہ کسی جزا کے اور نہ شکریے کے!“

اس اشکال کا ایک سطحی سا حل بعض حضرات نے اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے کہ روزے میں ریا ممکن نہیں ہے جب کہ بقیہ تمام عبادتوں میں ریا کا امکان ہے‘ اس لیے کہ روزے کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہے جو لوگوں کو نظر آ سکے بلکہ وہ ایک راز ہے عبد اور معبود کے مابین۔ ظاہر ہے کہ یہ توجیہہ بالکل بے بنیاد ہے‘ اس لیے کہ نماز میں ریا یہی تو ہے کہ پڑھے تو انسان نماز ہی لیکن **خالصةً لِوَجْهِ اللّٰهِ** نہ پڑھے بلکہ اس میں لوگوں کو دکھانے کی نیت شامل ہو جائے‘ بعینہٖ یہی معاملہ روزے کے ساتھ بھی ممکن ہے —— رہی دوسری انتہائی صورت کہ انسان روزے سے نہ ہو اور لوگوں سے کہے کہ میں روزہ سے ہوں تو یہ ریا نہیں دھوکا اور فریب ہے اور اس کے مقابل کی صورت نماز کے معاملے میں یہ ہوگی کہ کوئی ظاہراً تو نماز کے لیے دست بستہ کھڑا ہو جائے لیکن بجائے سورۃ الفاتحہ کے کوئی عشقیہ اشعار شروع کر دے۔ یا نعوذ باللہ من ذالک‘ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کو گالیاں دینا شروع کر دے! —— پھر ایک نص قطعی کے طور پر موجود ہے وہ حدیث بھی جس کی رُو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہُ احمد، مشکوۃ باب الریاء والسمعۃ)

''جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا، اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا، اور جس نے خیرات دی دکھاوے کی غرض سے وہ بھی شرک میں ملوث ہو چکا!''

اس حدیثِ قُدسی کا یہی وہ اشکال ہے جس کے باعث یہ عام واعظین کے مواعظ میں تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اسلام کے جدید 'مفکّرین' کی تحریر و تقریر میں بار نہیں پاتی۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ دین کے بہت سے دوسرے لطیف تر حقائق جیسے عہد الست، وَحی، الہام، کشف اور رُؤیائے صادقہ وغیرہ کی طرح اس حدیثِ قُدسی کی حقیقت بھی ان لوگوں پر منکشف نہیں ہو سکتی جو دَورِ حاضر کے مادّہ پرستانہ اور عقلیّت پسندانہ رُجحانات کے زیرِ اثر رُوحِ انسانی کے جسدِ خاکی سے علیحدہ مستقل وجود اور جداگانہ تشخص اور اُس کے ذاتِ باری کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق کے یا تو سرے سے قائل ہی نہیں ہیں یا کسی درجے میں ہیں بھی تو اُس کے اعتراف و اعلان میں جھجک اور حجاب محسوس کرتے ہیں! — بقول اکبرؔ الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں   کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اس لیے کہ اس حدیثِ قدسی کی واحد ممکن توجیہہ یہ ہے کہ روزہ روح کے تغذیہ و تقویت کا ذریعہ ہے جسے ایک تعلقِ خاص اور نسبتِ خصوصی حاصل ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ، لہٰذا یہ گویا خاص اللہ کے لیے ہے جس کی جزا وہ بطورِ خاص دے گا۔ یا یوں کہہ لیں کہ چونکہ اس کا حاصل ہے تقرب الی اللہ تو گویا اللہ خود ہی بنفسِ نفیس اس کی جزا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'ارواحِ انسانی' کا ایجاد و اِبداع 'اجساد' کی تخلیق سے بہت پہلے ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ'' (مُسلم عن ابی ھُریرہؓ) کی صورت میں ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کی عالم اجساد میں تخلیق سے بہت قبل، خود ان کی اور ان سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ارواح مستقل جداگانہ تشخص اور پورے شعورِ ذات اور فیما بین جملہ امتیازات کے ساتھ موجود تھیں۔

اس حقیقت کے ادراک و شعور کے بغیر، واقعہ یہ ہے کہ عہدِ الست کا وہ اہم واقعہ جسے قرآن مجید نے بڑے اہتمام اور شدّ و مدّ کے ساتھ بیان کیا ہے اور جسے محاسبہ اخروی کے ضمن میں ایک اہم حجت قرار دیا ہے یا تو محض تمثیل و استعارہ قرار پاتا ہے یا پھر اس کے بارے میں اچھے اچھے مصنفین کے قلم سے بھی نادانستہ انتہائی لغو اور مہمل جملے نکل جاتے ہیں۔(۱) سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ عہد اجسادِ انسانی کی تخلیق

---

(۱) مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: ''یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد سوم، صفحہ ۳۹۴)

سے قبل عالمِ ارواح میں ارواحِ انسانی نے پورے ہوش اور شعور کے ساتھ کیا اور میدانِ حشر میں جب تمام نسلِ انسانی دوبارہ (۱) ''جُنُوۡدٌ مُّجَنَّدَۃ'' کی صورت میں اپنے خالق کے سامنے پیش ہوگی تو یہی عہدِ الست ان کے خلاف حجتِ اولیٰ کے طور پر پیش ہوگا! (''مبادا تم کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی یا یوں کہنے لگو کہ اصل میں تو شرک کا ارتکاب کیا تھا ہم سے بہت پہلے ہمارے آباء واَجداد نے اور ہم تو بعد میں ان کی نسل میں پیدا ہوئے تھے!'' سورۃ الاعراف' آیات ۱۷۲'۱۷۳)

اسی طرح اس حقیقت کو جانے اور مانے بغیر کوئی توجیہہ ممکن نہیں ان متعدد احادیث کی جن سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ صرف یہ کہ خلق کے اعتبار سے سب پر مقدم ہیں بلکہ آپ اس وقت بھی نبی تھے جبکہ ابھی جسدِ آدمؑ تخلیق وتسویہ کے مراحل سے گزر رہا تھا ——— اس سلسلے میں اس روایت سے قطع نظر جس میں ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوۡرِیۡ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ محدثین کرام کے نزدیک مستند نہیں ہے' آخر اس حدیث کی کیا توجیہہ ممکن ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنۡ اَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ ؓ قَالَ :قَالُوۡا :یَا رَسُوۡلَ اللّٰہ مَتٰی وَجَبَتۡ لَکَ النُّبُوَّۃُ؟ قَالَ :((وَآدَمُ بَیۡنَ الرُّوۡحِ وَالۡجَسَدِ)) (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیثٌ حسنٌ)

''ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! آپؐ کو نبوت کب ملی؟ فرمایا: ''اُس وقت جب آدم ؑ ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی!)۔'' ترمذی بحوالہ ترجمان السنّہ اول

ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اجسادِ انسانی کی تخلیق سے بہت قبل ارواحِ انسانی خلعتِ وجود سے مشرف ہو چکی تھیں اور ان کے مابین مراتب ومناصب کے جملہ امتیازات بھی موجود تھے۔

بعدازاں جیسے ہی آدم کے جسدِ خاکی کا ہیولیٰ تخلیق وتسویہ کے طویل مراحل طے کر کے اس قابل ہوا کہ روحِ آدم اس سے ملحق کی جا سکے تو نفخ روح ہوا اور روح و جسد کا یہ مجموعہ مسجودِ ملائک قرار پایا' بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ ﴿وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝۲۸ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ

---

(۱) ﴿وَعُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍۭ ۫ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ۝۴۸﴾ (الکھف)

''اور وہ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے صف در صف (تب وہ فرمائے گا کہ) آ پہنچے ہو تم ہمارے پاس بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے پیدا فرمایا تھا تمہیں پہلی بار۔ لیکن تم تو اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم تمہارے لیے اس ملاقاتِ موعودہ کے لیے کوئی وقت نہ متعین کریں گے!''

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝٢٩﴾ (الحجر)

’’اور (یاد کرو) جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے‘ میں پیدا کرنے والا ہوں اس سنے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر کھنکھنانے لگا ہے ایک بشر‘ تو جب میں اسے پوری طرح مکمل کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں۔‘‘

٢۔ ﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝٧١ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝٧٢﴾ (ص)

’’(یاد کرو) جب کہا تیرے رَب نے فرشتوں سے: میں بنانے والا ہوں مٹی سے ایک بشر‘ تو جب میں اسے پوری طرح بنا کر درست کر دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں۔‘‘

اور پھر پوری نوعِ انسانی کو صُلبِ آدم سے متعلق کر دیا گیا۔ چنانچہ جیسے جیسے ارحامِ امہات میں افرادِ نوعِ انسانی کے اجساد تیار ہوتے رہے ایک خاص مرحلے پر جنودِ ارواح میں سے ایک ایک روح ان کے ساتھ متعلق کی جاتی رہی۔ جس کو تعبیر کیا سورۃ المؤمنون میں ’’خَلْقًا اٰخَرَ‘‘ کے الفاظِ مبارکہ سے اور جس کی خبر دی مزید وضاحت کے ساتھ صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ السلام نے۔ از روئے آیات و حدیث مندرجہ ذیل:

١۔ ﴿وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝٧ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝٨ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ﴾ (السجدۃ)

’’اور اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا مٹی سے‘ پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے۔ پھر اس کو درست کیا پوری طرح اور پھونکا اس میں اپنی روح میں سے!‘‘

٢۔ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝١٢ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝١٣ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝١٤﴾ (المؤمنون)

’’اور ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔ پھر کر دیا ہم نے اس کو ایک بوند جمے ہوئے ٹھکانے میں۔ پھر بنایا اس بوند سے ایک علقہ اور پھر بنایا اس علقہ سے ایک لوتھڑا‘ پھر بنائیں اس لوتھڑے سے ہڈیاں‘ پھر پہنایا ہڈیوں کو گوشت‘ اور پھر اٹھایا اسے ایک اور ہی اٹھان پر۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب سے اچھی تخلیق فرمانے والا!‘‘

٣۔ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ: ((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ

يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) (رواه البخاری و مسلم)

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے جو سچے ہیں اور ان کی سچائی مُسلَّم ہے کہ: ”تم میں سے ہر ایک کی تخلیق رحمِ مادر میں چالیس دن تو نطفے کی صورت میں ہوتی ہے، پھر اتنے ہی دن علقہ کی صورت میں، پھر اتنے ہی دن مضغہ کی صورت میں۔ پھر اس کے بعد ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں رُوح پھونکتا ہے۔“ (اس حدیث کو روایت کیا امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے)

واضح رہے کہ یہاں روح سے مراد زندگی لینا بہت بڑا مغالطہ ہے، اس لیے کہ بے جان تو نہ وہ **”بَيْضَةُ الْاُنْثٰى“** ہی ہوتا ہے جو طویل مسافت طے کر کے رحم میں پہنچتا ہے اور نہ **”نُطْفَةُ الرَّجُل“** جو نہایت جوش وخروش سے حرکت کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اس میں داخل ہوتا ہے۔ رہے علقہ اور مضغہ تو ان میں تو نشوونما کا خالص حیاتیاتی عمل انتہائی زور شور سے جاری ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بے جان مادے میں زندگی پھونکنے کا کوئی سوال نہیں بلکہ جسد انسانی کے ساتھ جو تخلیق وتسویہ کے مراحل طے کر رہا ہے روحِ انسانی کے الحاق کا معاملہ ہے، فافهم و تدبر!

اب آیئے اصل موضوع کی طرف!

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے، جو دو اَجزاء پر مشتمل ہے: ایک اس کا وجودِ حیوانی جو مجموعہ ہے جسم اور جان یا جسد وحیات دونوں کا اور دوسرے روحِ⁽¹⁾ انسانی جس کے شرف ومجد کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف نسبت دی! ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾۔ ایک کا تعلق ہے عالم خلق سے جس میں تخلیق وتسویہ کا عمل لازماً تدریج وارتقاء کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے، جب کہ دوسرے کا تعلق ہے عالم امر سے جہاں ابداع اور ایجاد وتکوین کا ظہور کن فیکونی شان کے ساتھ ہوتا ہے، بحوائے الفاظِ قرآنی:

١۔ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسرائیل: ٨٥)

”اور وہ پوچھتے ہیں تم سے روح کے بارے میں۔ کہو روح میرے ربّ کے امر سے ہے!“

٢۔ ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ ۢبِالْبَصَرِ ۝٥٠﴾ (القمر)

”اور نہیں ہے ہمارا امر مگر بس ایسے جیسے ایک لپک نگاہ کی!“

---

(1) اکثر لوگ روح کو حیات یا زندگی کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ زندگی تو جمیع حیوانات ہی نہیں نباتات تک میں ہے۔ وہ روح ربانی جس سے انسان جملہ حیوانات سے ممیز ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے۔

۳۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یٰسٓ)

''اور اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ وہ بس کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور ہو جاتا ہے!''

مزید برآں — ایک کا رجحان ہے عالَمِ سفلی کی طرف جبکہ دوسرے کی پرواز ہے عالَمِ علوی کی جانب' بلکہ ایک بالقُوّہ ''اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ'' (التین) کے حکم میں ہے تو دوسرے کا اصل مقام اعلیٰ ''عِلِّيِّيْنَ'' (المطففین) میں ہے' ایک خاکی الاصل ہے اور ''كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ''[1] کے مصداق ﴿وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (الاعراف: ۱۷۶) کی مکمل تصویر' جبکہ دوسرا نوری الاصل اور ع: ''اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!'' کے مصداق ہمیشہ عالمِ بالا کی جانب مائل و متوجّہ۔ ایک خالصتاً حیوانات کی سطح پر ہے تو دوسرا فرشتوں کا ہم رتبہ ہی نہیں بالقُوّہ ان سے بھی آ گے! بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

آدمی زادہ طُرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

گویا دونوں باہم متضاد و متصادم ہیں۔ چنانچہ ایک تقویت پاتا ہے تو دوسرا لازماً مضمحل ہوتا ہے اور ایک کا دباؤ بڑھے تو دوسرے کا کچلا جانا لازمی ہے! چنانچہ بطن و فرج کے تقاضوں کی بھرپور تسکین اور کثرتِ آرام واستراحت سے روح مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب انسان کا جسدِ خاکی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا الغرض ہر اعتبار سے زندہ ہی نہیں خوب فربہ و توانا[2] نظر آتا ہے در آنحالیکہ اس کی روح' کمزور اور لاغر ہوتی ہوتی بالآخر سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے اور جسد انسانی اس روح کے لیے چلتی پھرتی قبر بن کر رہ جاتا ہے' بقول علامہ اقبال ع ''روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد!'' اور بمصداقِ الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ (النمل: ۸۰' الروم: ۵۲)

''یقیناً (اے نبی ﷺ!) تم نہیں سنا سکتے (اپنی بات) مُردوں کو اور نہ سنا سکتے ہو (اپنا پیغام) بہروں کو!''

افسوس کہ دورِ حاضر میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے تسلط کے باعث روح اور جسد کے جداگانہ تشخص

---

[1] ایک مقولہ: ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے!

[2] قرآن حکیم نے ایک سے زائد مقامات پر منافقین کے 'تن و توش' کی جانب خصوصی اشارے کیے ہیں مثلاً سورۃ المنافقون میں فرمایا:

﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۭ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۭ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۭ﴾ (آیت ۴)

''اور (اے نبی ﷺ!) جب تم انہیں (یعنی منافقین کو) دیکھتے ہو تو ان کے تن و توش سے متاثر ہو جاتے ہو۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کو بغور سنتے ہو' حالانکہ درحقیقت وہ سوکھی لکڑیوں کے مانند ہیں جنہیں سہارے سے رکھ دیا گیا ہو۔''

اور ان کے تقاضوں کے باہم متضاد و متصادم ہونے کا شعور و ادراک عوام تو کجا خواص تک کو حاصل نہیں رہا۔ حتیٰ کہ بہت سے ’جدید مفکرینِ اسلام‘ تو اس حقیقت کبریٰ کا ذکر بھی بطرزِ استہزاء و استحقار کرتے ہیں۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے ’مفکرِ اسلام‘(۱) ’’اسلام کا روحانی نظام‘‘ کے عنوان سے ایک نشری تقریر میں فرماتے ہیں:

> ’’فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کار فرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں —— اسلام کا نقطہ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے——‘‘

اس ضمن میں انہوں نے ’دنیا پرستی‘ اور ’ترکِ دنیا‘ کی دو انتہائی صورتوں کی جو تردید کی ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب کیوں منعطف نہ ہوئی کہ انسانی تاریخ میں ان دونوں انتہاؤں کی موجودگی بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ انسانی شخصیت میں دو بالکل متضاد اور مخالف قوتیں کارفرما ہیں جن کے مابین مسلسل رسہ کشی جاری رہتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دوسری کا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومؔی کبھی پیچ و تابِ رازؔی

اسلام بلاشبہ ان کے مابین توازن پیدا کرنا چاہتا ہے اور عدم توازن (۲) کو ہرگز پسند نہیں کرتا، لیکن توازن کا یہ تصور بجائے خود دلیل قاطع ہے جسد اور روح کے تضاد اور ان کے تقاضوں کے باہم متقابل و متبائن ہونے کی۔ بقول شاعر ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای!
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

(۲) اگرچہ عدم توازن کی تمام صورتیں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ بہت فرق ہے اس عدم توازن میں جو دنیا پرستی یا شکم پروری و شہوت پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس عدم توازن میں جو ترکِ دنیا یا رہبانیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ سابقہ اُمتوں میں عدم توازن کی پہلی صورت کی مثال یہود ہیں جنہیں ’’اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ‘‘ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہیں صرف ’’اَلضَّآلِّیْنَ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید تقابل کے لیے دیکھئے سورۃ الحدید، جس کے وسط میں یہود کا ذکر ہے جن کی دنیا پرستی نتیجہ تھی ’’قساوتِ قلبی‘‘ کا اور آخر میں متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جن کی رہبانیت کو اگرچہ بدعت قرار دیا گیا لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ تھی یہ نیکی کے جذبے ہی کی ایک غیر معتدل صورت!

واقعہ یہ ہے کہ فکر و نظر کی اس بنیادی غلطی نے تصورِ دین کی پوری عمارت ہی کو کج کر ڈالا ہے۔ چنانچہ جب 'روح' صرف زندگی کے ہم معنی ہو کر رہ گئی تو 'دین' بھی بس ایک 'نظامِ حیات' بن کر رہ گیا اور مذہب کا ایک ایسا لا مذہبی (secular) ایڈیشن تیار ہو گیا جس میں مذہب کے لطیف حقائق سرے سے خارج از بحث ہو گئے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج! تا ثریا می رود دیوار کج!!

* * *

ایک حقیقت کی جانب مزید توجہ فرما لیجیے!

جسدِ انسانی یا انسان کا وجودِ حیوانی خاکی الاصل ہے' چنانچہ اس کی جملہ ضرورتیں اور اس کے تغذیہ و تقویت کا تمام سامان بھی زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے' جبکہ روحِ انسانی قدسی الاصل اور ''امر ربّ'' ہے لہٰذا اس کے تغذیہ و تقویت کی ضروت بھی تمام تر کلامِ ربانی ہی سے پوری ہو سکتی ہے جسے قرآن حکیم نے روح(۱) ہی سے تعبیر کیا ہے' از روئے آیاتِ مبارکہ:

۱۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

''اور اسی طرح (اے نبی ﷺ!) ہم نے وحی کی تمہیں ایک رُوح اپنے امر سے (اس سے پہلے) تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ لیکن (اب) بنا دیا ہے اسے ایک نور جس کے ذریعے ہدایت دیتے ہیں ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں!''

۲۔ ﴿يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (المؤمن: ۱۵)

''اِلقاء فرماتا ہے روح اپنے امر سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے!''

۳۔ ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ﴾ (النحل: ۲)

''نازل فرماتا ہے فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے امر سے' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے!''

---

(۱) یہاں اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو جائے کہ وحی کے لانے والے کو بھی قرآن نے کہیں ''روح القدس'' سے موسوم فرمایا ہے اور کہیں ''الروح الامین'' سے اور مہبطِ وحی بھی قرار دیا ہے قلب کو جو دراصل بمنزلہ ''شاہ درہ'' ہے شہر روح کے لیے۔ تو حقیقت وحی کے ضمن میں بھی ایک کلید مل جاتی ہے اگرچہ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے! گویا وحی خود بھی روح' اس کے لانے والا بھی روح اور اس کا مہبط بھی روح۔ جگر کا ایک شعر اس نغمہ وحی کی ماہیت کو خوب واضح کرتا ہے ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے!

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں' ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماعِ قرآن! اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے' تاہم قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرما دیا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزو لاینفک! چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کے لیے ماہِ رمضان معیّن ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآنِ مجید نازل ہوا تھا۔ گویا یہ ہے ہی نزول قرآن کا سالانہ جشن!

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔''

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) امام بیہقیؒ نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضورﷺ کا 'شعب الایمان' میں نقل کیا ہے' اس کے الفاظ ہیں:

((جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ فَرِیْضَةً وَ قِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا))

''اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اس کا قیام اپنی مرضی پر۔''

گویا قیام اللیل اگرچہ ''تَطَوُّعًا'' ہے تاہم اللہ کی جانب سے 'مجعول' بہرحال ہے!

(۲) بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضورﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))

''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ' اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ۔''

(۳) امام بیہقیؒ نے 'شعب الایمان' میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا کہ آنحضورﷺ نے فرمایا کہ:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' فَیُشَفَّعَانِ))

''روزہ اور قرآن دونوں بندہ مؤمن کے حق میں سفارش کریں گے' روزہ کہے گا: اے رب! میں نے اسے روکے رکھا دن میں کھانے اور خواہشات سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما اور قرآن کہے گا:

میں نے روکے رکھا اسے رات کو نیند سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ تو دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔ ‘‘

اور اب غور فرمایئے صوم رمضان کی حکمتوں پر!

حقائق متذکرہ بالا کے پیش نظر صیام و قیامِ رمضان کی اصلی غایت و حکمت اور ان کا اصل ہدف و مقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ —— ایک طرف روزہ انسان کے جسدِ حیوانی کے ضُعف و اضمحلال کا سبب بنے تا کہ روحِ انسانی کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی روح کو سانس لینے کا موقع ملے —— اور دوسری طرف قیام اللیل میں کلامِ ربانی کا روح پرور نزول^(۱) اس کے تغذیہ و تقویت کا سبب بنے —— تا کہ ایک جانب اس پر کلامِ الٰہی کی عظمت کما حقہٗ منکشف ہو جائے اور وہ اچھی طرح محسوس کر لے کہ یہی اس کی بھوک کو سیری اور پیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اس کے دُکھ کا علاج اور درد کا درماں ہے! —— اور دوسری جانب روحِ انسانی از سرِ نو قوی اور توانا ہو کر ’’اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز‘‘ ہو۔ گویا اس میں تقرّب اِلی اللہ کا داعیہ شدت سے بیدار ہو جائے اور وہ مشغولِ دعا و مناجات ہو جو اصل روح ہے عبادت^(۲) کی اور لُبّ لُباب ہے رُشد و ہدایت کا!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں صوم و رمضان سے متعلق آیات^(۳) میں:

اولاً —— مجرد صوم کی مشروعیت اور اس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اس کی غرض و غایت بیان ہوئی ﴿لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾ کے الفاظ میں اور

ثانیاً —— صومِ رمضان کی فرضیت اور اس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر:

ایک —﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝۱۸۵﴾ (البقرۃ) کے الفاظ میں‘ جو عبارت ہے انکشافِ عظمتِ نعمتِ قرآن اور اس پر اللہ کی جناب میں ہدیہ تکبیر و تشکر پیش کرنے سے —— اور

دوسرے —— ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا

---

(۱) ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف! (اقبال)

(۲) احادیث نبویہ علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) اور ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ))۔

(۳) سورۃ البقرۃ‘ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۷۔

دَعَانِ ...... لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۱۸۶﴾ (البقرۃ) کے الفاظ میں جو عبارت ہے انسان کے متوجّہ الی اللہ و متلاشی ٔقربِ الٰہی اور مشغولِ دُعا اور محو مناجات ہونے سے' جو اصل حاصل ہے عبادتِ ربّ کا!

الغرض! صیام و قیامِ رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ روح انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلّط سے نجات پا کر گویا حیاتِ تازہ حاصل کرے اور پوری شدت و قوت اور کمالِ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جائے!

اب ذرا ایک بار پھر سوچیے کہ یہ 'روحِ انسانی' درحقیقت ہے کیا؟ جیسے کہ پہلے واضح ہو چکا ہے' یہ ''اَمْرِ رَبِّی'' بھی ہے اور جلوۂ ربانی بھی۔ اس کا تعلق ذاتِ خداوندی کے ساتھ بالکل وہی ہے جو سورج کی ایک کرن کا سورج کے ساتھ کہ لاکھوں اور کروڑوں میل دور آ جانے کے باوجود اپنے منبع سے منقطع اور اپنے جداگانہ وجود کے باوصف اپنی اصل سے منفصل نہیں ہے —— بعینہٖ یہی کیفیت ہے روحِ انسانی کی کہ اپنے علیحدہ تشخص کے باوجود خدا سے منفصل نہیں بلکہ متصل ہے' بقول عارف رومیؔ ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس!

گویا قلبِ انسانی کی مکین روحِ ربانی براہ راست متّصل ہے ذاتِ رب کے ساتھ اور یہی ہے وہ عظیم امانت جس کے بارِگراں کے نہ سماوات متحمل ہو سکے نہ ارض و جبال' لیکن جو حصے میں آئی ظَلوم و جَہول انسان[1] کے: ؎

آسمان بارِ امانت نتواں گشت کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے قلبِ مؤمن کی مکین خود ذاتِ الٰہی ہے:

((مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ وَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ))

''میں نہ زمین میں سما سکا نہ آسمان میں' البتہ اپنے مؤمن بندے کے دل میں میری سمائی ہو گئی۔'' (احیاء علوم الدین' امام غزالیؒ' ج ۳' ص ۱۴)

؎ من نگنجم در زمین و آسماں لیک گنجم در دلِ مؤمن عیاں! (سعدیؔ)

تو کیا بالکل درست نہیں یہ قول مبارک کہ ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ'' —— بلکہ ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ'' —— اس لیے جب کہ دوسری بدنی اور مالی عبادتوں کا حاصل ہے تزکیہ و تطہیر نفس' وہاں صوم رمضان کا حاصل ہے تغذیہ و تقویت رُوح جو متعلق ہے براہ راست ذاتِ خداوندی کے ساتھ —— لہٰذا

---

[1] سورۃ الاحزاب:۳۳:۷۲

روزہ ہوا خاص اللہ کے لیے' اب چاہے یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی اس کی جزا دے گا یا یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی بہ نفس نفیس اس کا انعام ہے' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کوئی بندہ خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو وہ بھی کمالِ شفقت و عنایت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جائے —— یہاں تک کہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے اگر بندہ اس کی جانب چل کر آتا ہے تو وہ بندے کی جانب دوڑ کر آتا ہے اور اگر بندہ اس کی طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو وہ بندے کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہے —— گویا بقول علامہ اقبالؔ مرحوم ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!
راہ دکھلائیں کسے؟ رَہروِ منزل ہی نہیں!

* * *

بقیہ: حرفِ اول

علم کا انحصار مسلک دیوبند کے مدارس پر ہی ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو بتایا جائے کہ اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے مدارس سے فارغ التحصیل اور سند یافتہ علماء کا ''غیر مقلد'' ہونا فاضل مصنف کے نزدیک قابلِ اعتراض نہیں؟ اور کیا مقلدین کے نزدیک غیر مقلد ہونا ایک نوع کی ''گالی'' نہیں بن گیا ہے؟ گویا مسئلہ سند یافتہ ہونے یا نہ ہونے کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے! ہم یہ مقدمہ اس لیے پیش کرنے پر مجبور ہیں کہ زوالِ امت کا ایک یہ بھی مظہر ہے کہ آج اہلِ علم کا سارا زور' الا ماشاء اللہ' دین کی اشاعت و تبلیغ نہیں بلکہ اپنے مسلک کا تفوق اور اس کے دلائل وضع کرنے پر صَرف ہو رہا ہے اور اس کے لیے ایسی ایسی تاویلات وضع کی جاتی ہیں کہ
ع ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!''

آخر میں ہم اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحبؒ اپنی تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود ایک انسان ہی تھے۔ اُن سے کوتاہیوں اور لغزشوں کا صدور اسی طرح ہی ممکن ہے جیسے کسی دوسرے انسان سے۔ لیکن خدارا انہیں زبردستی اسلاف سے الگ کر کے نہ کھڑا کیا جائے اور اس معاملے میں علمی' اخلاقی اور عقل و منطق کے تقاضوں کو پسِ پشت نہ ڈالا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین

کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ترتیب و تدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

سُورَۃُ الْمُمْتَحِنَۃ

سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک دس مدنی سورتوں کا گلدستہ ہے جو قرآن حکیم میں سورتوں کی تعداد کے حوالے سے مدنی سورتوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ یہ سورتیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اصل خطاب مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ ہے اور ان سورتوں کے جو اہم مضامین ہیں وہ بھی مسلمانوں ہی سے متعلق ہیں۔ دوسری مشترک بات ان سورتوں میں یہ ہے کہ ان میں انداز جھنجھوڑنے والا ہے' یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جذباتِ ایمانی' جوشِ جہاد اور جذبہ انفاق میں کوئی کمی آ رہی ہو جس پر ملامت کی جا رہی ہو۔ آج کے دور کے مسلمان' جن میں اب یہ چیزیں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں بلکہ ناپید ہو گئی ہیں' اگر توجہ کے ساتھ ان سورتوں کا مطالعہ کریں تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ اُن کے جذبہ ایمانی میں کچھ حرارت پیدا ہو جائے اور جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کو بھی جلا مل جائے۔ بہرحال آج کی پہلی زیر درس سورۃ ''الممتحنۃ'' ہے۔

سورۃ الممتحنۃ اپنے مضامین کے اعتبار سے سورۃ المجادلہ کے بہت مشابہ ہے۔ سورۃ المجادلہ میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ آئی تھی کہ حزب اللہ ہونے کے اعتبار سے مسلمانوں میں یہ وصف راسخ ہو جاتا ہے کہ ان کی دلی محبتیں صرف اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہوں اور باقی ساری محبتیں اس کے تابع ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو جماعتی زندگی بہت کمزور ہوگی اور اللہ کی راہ میں ایسی جدوجہد نہ ہو سکے گی جیسے اس کا حق ہے۔ سورۃ الممتحنۃ کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہو رہا ہے۔ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ (آیت ۱)

''اے اہلِ ایمان! میرے اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ۔''

یعنی دوستی اور دشمنی کا معیار اللہ کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ملاحظہ ہو:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ))(سنن ابی داوٗد)

''جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لیے اور کسی سے دشمنی رکھی تو اللہ کے لیے' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لیے اور کسی سے کچھ روکا تو بھی اللہ کے لیے' تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔''

اس کے بعد آیت ۳ میں بھی یہی مضمون بڑی تاکید اور اہتمام کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں فرمایا گیا:

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ③

''قیامت کے دن نہ تمہارے رشتہ دار کچھ فائدہ دیں گے اور نہ تمہاری اولاد۔ اُس روز وہی تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔''

پہلے رکوع کے آخر (آیت ۵) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی ایک دعا نقل ہوئی ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ⑤﴾

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں کفار کے لیے تختۂ مشق نہ بنا اور اے ہمارے پروردگار! ہمیں معاف فرما دے۔ یقیناً تُو غالب' حکمت والا ہے۔''

یعنی وہ اپنے رب کے حضور دعا گو تھے کہ یارب' ہمیں ان ظالموں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے بچانا' اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے مکّہ میں مسلمان ستائے جا رہے تھے اور ہر طرح کا ظلم ہو رہا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ مکہ کو تو گویا مہلت دی جا رہی تھی اور اہلِ ایمان کی بہت سخت آزمائش ہو رہی تھی —— انسان کو ہمیشہ آزمائش سے بچنے اور آزمائش آ جانے کی صورت میں سرخرو ہونے کی دعا کرنی چاہیے۔

سورۃ کے آخر میں خواتین کی بیعت کا ذکر ہوا ہے جبکہ مَردوں کی بیعت کا مفصل ذکر سورۃ الفتح میں بیعتِ رضوان کے حوالے سے آ چکا ہے۔ یہاں پر ارشاد ہوا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑫

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر آپ سے بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ نہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کریں گی' نہ چوری کریں گی' نہ بدکاری کا ارتکاب کریں گی' نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی' نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت میں ﴿وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ کے الفاظ آئے ہیں' جو بڑے بامعنی الفاظ ہیں۔ ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کسی پر زنا کی تہمت نہ لگائی جائے جو قذف ہے' جبکہ ان الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں کے الفاظ انسان کی شرمگاہ کے لیے ایک استعارہ ہے اور عورت کی طرف سے اس معاملہ میں تہمت یہ ہے کہ وہ کسی اور کی اولاد اپنے شوہر کے نام کر دے۔ یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔

سُورۃ الصَّف

اس سے پہلے بھی یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک دس مدنی سورتوں کا یہ مجموعہ بہ لحاظِ تعداد قرآن حکیم کا مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے اور اس کے بالکل وسط میں سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ آئی ہیں۔ سورۃ الممتحنہ کے بعد اس مدنی گلدستے کی بقیہ چھ سورتیں حسین و جمیل جوڑوں کی شکل میں ہیں اور ان میں بھی سب سے زیادہ حسین جوڑا سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا ہے۔ جوڑے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سورتیں مل کر کسی ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں سورتیں مل کر رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے دو پہلو' آپ ﷺ کا مقصد بعثت اور اس مقصد کو پورا کرنے کے طریقہ کار' کی تکمیل کرتی ہیں۔

سورۃ الصّف ''مُسَبِّحات'' میں سے ہے۔ اس کے آغاز میں فرمایا:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

''اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے' اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس سورۃ کی مرکزی آیت اس کے پہلے رکوع کی آخری آیت ہے' جس میں فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ⑨

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول ؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ غالب کرے اس کو کُل کے کُل دین پر خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ جو بات سورۃ الحدید میں تمام انبیاء و رسل کے لیے آئی تھی کہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کتابوں اور میزان کے ساتھ تا کہ لوگ عدل پر قائم ہوں' اب وہی بات متعین طور پر حضور اکرم ﷺ کی شان میں آئی ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ دین اس لیے نہیں آیا کہ آپ کی تحقیق کا موضوع بن جائے یا زبان سے بس اس کی مدح کی جاتی رہے بلکہ درحقیقت یہ دین تو ایک نظام زندگی ہے اور نظام ہوتا ہی وہ ہے جو بالفعل قائم ہو۔ اب ظاہر بات ہے کہ غیر مسلم اور کفار اس دین (نظامِ زندگی) کے غالب ہونے کو گوارا نہیں کریں گے' وہ تو رکاوٹیں ڈالیں گے' جبکہ نبی کا کام یہ ہے ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اس دین کو قائم اور غالب کرے۔

آگے آیت ۱۰' ۱۱ میں اہلِ ایمان کو جہاد کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس کو ایک ایسی تجارت سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جو انہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلانے والی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪

> ''اے ایمان والو! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں ایسی تجارت کی طرف جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے! (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

ظاہر ہے کہ تجارت میں بھی جان اور مال دونوں لگانے پڑتے ہیں اور جہاد میں بھی ان ہی دونوں چیزوں کو لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ میں اس تجارت کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ⑬﴾ ''اور ایک دوسری شے بھی (تمہیں حاصل ہو گی) جو تمہیں بہت پسند ہے۔ اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح۔ اور مؤمنین کو اس کی خوشخبری دے دو''۔ یعنی اگر ہم اپنے جان و مال کے ساتھ اللہ کے دین کی مدد کریں گے تو اُخروی کامیابی کے ساتھ ساتھ اس دُنیوی زندگی میں بھی ہمیں نصرتِ خداوندی حاصل ہو گی۔ سورۂ محمد میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ⑦﴾ ''اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا''۔ اسی طرح سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (139)﴾ ''(دیکھو) بے دل نہ ہونا اور غم نہ کرنا اگر تم مؤمن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے''۔ یہی موضوع زیرِ مطالعہ سورۃ الصّف کی آخری آیت میں اپنے عروج (climax) کو پہنچتا ہے جس میں اللہ نے اہلِ ایمان کو اپنا مددگار قرار دیا ہے۔ فرمایا:

> یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ (آیت ۱۴)
>
> ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جیسے عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟''

یہاں یہ بات بھی نوٹ کریں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ (جو سورۃ الحدید کی عظیم ترین آیت ہے) کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ ''تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون ہیں جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے''۔ اب اسی مضمون پر سورۃ الصّف کا بھی اختتام ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے میری نظر میں پوری سورۃ الصّف سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کی تشریح ہے۔

اس کے علاوہ سورۃ الصّف اور سورۃ الحدید کی ابتدائی آیت بھی تقریباً ایک جیسی ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ①﴾۔ اس ابتدائی آیت میں ڈانٹ کا پہلو بھی ہے کہ اگر تم بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کی تسبیح کر رہے ہو تو کون سا معرکہ سرانجام دے رہے ہو؟ وہ تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ کر رہا ہے! اللہ کو تو تم سے کچھ اور ہی مطلوب ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف کی آیت ۴ میں ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④﴾ ''اللہ کو تو وہ لوگ محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند''۔ بقولِ شاعر ؎

مقامِ بندگی دیگر ' مقامِ عاشقی دیگر!
ز نوری سجدہ می خواہی ' ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اور اگر کوئی شخص اس کے لیے تیار نہیں تو پھر صرف زبان سے ہماری محبت کے بلند و بانگ دعوے کرنے کا حاصل کچھ نہیں ہوگا اور ایسا عمل تو اللہ کے غضب کو بھڑکانے والا ہے۔ اس حوالے سے آیت ۲' ۳ میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝۳

''اے اہلِ ایمان! ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں۔''

مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے ایک ایک حرف کو حرزِ جان بنائیں۔ شاید کہ اس سے وہ جوش اور ولولہ پیدا ہو جائے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

سُورةُ الجُمعَة

سورۃ الجمعہ کا شمار بھی ''مُسَبِّحَات'' میں ہوتا ہے اور اس سورۃ کا آغاز ''يُسَبِّحُ لِلّٰهِ'' کے الفاظ سے ہو رہا ہے جو کہ فعل مضارع ہے۔ عربی میں فعل مضارع میں زمانہ حال بھی پایا جاتا ہے اور زمانہ مستقبل بھی' جبکہ سورۃ الصّف کا آغاز ''سَبَّحَ لِلّٰهِ'' کے الفاظ سے ہوا تھا جو کہ فعل ماضی ہے۔ اس طرح سورتوں کے اس جوڑے میں زمانہ کی تکمیل ہوگئی۔ پہلی آیت میں فرمایا:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۝۱

''جو چیز بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے' جو حقیقی بادشاہ' پاک ذات' زبردست' حکمت والا ہے۔''

آیت ۲ اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے جس میں فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝۲

''وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول انہی میں سے جو تلاوت کرتا ہے ان پر اس (اللہ) کی آیات' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے' اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس آیت میں دین کو غالب کرنے کا طریقہ کار بتا دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کام کے لیے مردانِ کار یعنی اللہ کے ایسے وفادار بندے چاہئیں جو اس کام کے لیے اپنا تن مَن دھن لگا دینے کے لیے تیار ہوں۔ اب اس

حزب اللہ کو تیار کرنے کا طریقہ کار اس کتاب مبین کے گرد گھومتا ہے جو آلہ انقلابِ محمدیؐ ہے اور اسی کتاب مبین کے ذریعہ یہ تبدیلی برپا ہوگی — آیت کے ان الفاظ ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ کے ساتھ سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۹ کو بھی ذہن میں لایئے جس میں فرمایا گیا: ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾۔ اس آیت کا ایک ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے: ’’اس کے مضامین تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو پاک ہو چکے ہوں‘‘ —— سورۃ الجمعہ کی اس مرکزی آیت میں ’’يُزَكِّيْهِمْ‘‘ (ان کا تزکیہ کرتا ہے) کا لفظ پہلے لایا گیا ہے اور ’’يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ‘‘ (ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے) بعد میں لایا گیا ہے۔ اس ترتیب سے یہ واضح ہوا کہ باطن کی صفائی اور پاکیزگی پہلے ہے اور کتاب کی تعلیم بعد میں، اس لیے کہ علم درحقیقت اسی وقت مفید ہوتا ہے جب دل کی صفائی ہو چکی ہو۔ اس حوالے سے مولانا روم کا شعر ملاحظہ ہو: ؎

علم را بر دل زنی یارے بود!
علم را بر تن زنی مارے بود

یعنی اگر علم انسان کے دل پر اترتا ہے تو وہ علم انسان کا ساتھی اور رفیق ہے اور اگر علم صرف اوپر اوپر انسان کے تن و توش تک محدود رہے تو پھر وہ سانپ ہے جو آدمی کو ڈستا ہے۔

اس آیت میں تو یہ واضح کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جو کام بھی کر رہے ہیں وہ قرآن حکیم کے ذریعے کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی آیت ۵ میں بنی اسرائیل کے حوالے سے یہ بتا دیا گیا کہ ہم نے ان کو جو کتاب دی تھی انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا اور اسے بند کر کے رکھ دیا تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوگئی جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہو۔ فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

’’مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (یعنی اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا) اس گدھے کی سی (مثال) ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بری ہے مثال اس قوم کی جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اس مثال کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ تم لوگ قرآن کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرنا، ورنہ تمہارا معاملہ بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے یہود کا ہو چکا ہے۔

سورۃ کے آخر میں نمازِ جمعہ کے حوالے سے حکم آیا ہے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

’’اے ایمان والو! جب تمہیں نماز کے لیے پکارا جائے جمعہ کے دن تو سب کاروبار چھوڑ کر اللہ کی یاد کی طرف لپکو! یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانو۔ پس جب نماز ادا ہو چکے تو رزق کی تلاش میں زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا ذکر کثرت سے جاری رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

درحقیقت جمعہ تعلیم القرآن کا پروگرام ہے جس کو اس اُمت میں ابدی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اُس روز کوئی نائبِ رسول منبرِ رسولؐ پر بیٹھ کر خصوصی طور پر کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیہ کا وہی فریضہ سرانجام دے جو درحقیقت محمد ﷺ کا بنیادی کام اور انقلابِ نبوی کی جڑ اور بنیاد ہی نہیں ' بلکہ مرکز و محور بھی ہے۔

سُورۃُ المُنافقُون

مدنی سورتوں کے سب سے بڑے گلدستے (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) کی آخری چھ سورتیں دو دو کے جوڑے میں ہیں۔ ان میں سے ایک جوڑے سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کے مطالعہ کے بعد اب سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن پر مشتمل دوسرے جوڑے کا آغاز ہو رہا ہے۔ سورۃ التغابن میں ایمانیات کی بحث ہے لیکن اس سے پہلے سورۃ المنافقون کو لایا گیا ہے جس میں نفاق کے مرض اور اس کے علاج کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①

’’(اے محمد ﷺ!) یہ منافق جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تو خوب جانتا ہے کہ آپؐ اُس کے رسول ہیں' لیکن اللہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔‘‘

اس سے پہلے مدنی سورتوں مثلاً سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں نفاق کا مضمون بڑی تفصیل سے آ چکا ہے' لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تھا کہ یہ دس مدنی سورتیں مختلف مضامین کے خلاصے پر مشتمل ہیں۔ تو گیارہ آیات پر مشتمل سورۃ المنافقون میں ’’نفاق‘‘ کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۲' ۳ میں بیان کیا گیا ہے کہ نفاق کا مرض اصل میں ہے کیا۔ چنانچہ فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③

’’انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے پس وہ اللہ کے راستے سے رک گئے ہیں۔ اور یہ بہت ہی برا عمل ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ پہلے وہ ایمان لائے' پھر انہوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' سو اب وہ سمجھ رکھنے والے نہیں۔‘‘

اس آیت میں جو ان کے کفر کا ذکر ہے اس سے مراد قانونی کفر نہیں ہے' اس لیے اگر قانونی کفر ہوتا تو یہ مرتد قرار پاتے بلکہ یہاں مراد حقیقی کفر ہے جو ان کے باطن میں راسخ ہے اور یہ حقیقی اعتبار سے کافر ہو چکے ہیں۔

آیت ۶ میں منافقین کے حسرت ناک انجام اور محرومی کا نقشہ کھینچا گیا جو ان کا مقدر ہے۔ فرمایا: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑥﴾ ’’(اے محمد ﷺ!) ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں۔ اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے

گا۔ یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ گویا آپؐ کا استغفار بھی ان بدبختوں کے حق میں مفید نہیں ہے۔ اس حوالے سے سورۃ التوبہ کی آیت ۸۰ ذہن میں لائیے جو اس موضوع کے اعتبار سے سخت ترین آیت ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) خواہ آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (ان کے حق میں برابر ہے)۔ اگر آپ ان کے لیے ستر دفعہ بھی بخشش مانگیں تو بھی اللہ ان کو نہیں بخشے گا۔“

آیات ۹ تا ۱۱ میں نفاق سے بچنے کا علاج بتایا گیا ہے کہ اللہ کا ذکر وہ ٹانک ہے جو نفاق جیسے مرض سے بچانے والا ہے۔ یادِ الٰہی قلب و ذہن سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اور اگر اس کی کوئی چھوت لگ گئی ہو تو اس کے ازالہ کا علاج ہے ”انفاق“ یعنی جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ موت تمہارے سرہانے آ کھڑی ہو۔ چنانچہ آخری تین آیات میں ارشاد ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝ وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ فَيَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِىۡۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝ وَلَنۡ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝

”اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے، اور جو ایسا کریں گے تو وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ اور خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آ جائے تو (اس وقت) کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ اور جب کسی کی موت آ جاتی ہے تو اللہ اسے ہرگز مہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

سُورۃُ التَّغَابُن

جیسا کہ ماقبل ذکر ہو چکا کہ سورۃ التغابن میں ایمانیات کی بحث ہے۔ ایمانیات اگرچہ مکی سورتوں کا موضوع ہے اور مکی سورتیں بہت طویل سورتیں ہیں لیکن ایمانیات کا خلاصہ ان طویل مکی سورتوں سے نکال کر اٹھارہ آیات پر مشتمل سورۃ التغابن میں بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۃ التغابن کی ابتدائی چار آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات سے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران میں نے یہ بیان کیا تھا کہ سورۃ الحدید کی ابتدائی چھ آیات میرے اندازے (assesement) کے مطابق ذاتِ باری تعالیٰ کے موضوع پر قرآن مجید کی چوٹی کی آیات ہیں، اسی طرح زیر مطالعہ سورۃ التغابن کی ابتدائی چار آیات بھی اس موضوع کے اعتبار سے ان چھ آیات کے قریب تر ہیں۔ ان آیات میں فرمایا گیا:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ۚ لَهُ الۡمُلۡكُ وَلَهُ الۡحَمۡدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ

قَدِيْرٌ ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④

''اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ کُل کائنات کی) بادشاہی بھی اُسی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا کا مستحق حقیقی بھی صرف وہی ہے۔ مزید برآں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا' لیکن تم میں سے کچھ (اس کا) انکار کرنے والے ہیں اور کچھ (اس کو) ماننے والے ہیں' اور جو کچھ تم (اس دنیا میں) کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تمہاری نقشہ کشی کی اور تمہاری بہت ہی اچھی نقشہ کشی (اور صورت گری) فرمائی' اور (تمہیں) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' اور اللہ سینوں میں پوشیدہ رازوں کا بھی جاننے والا ہے۔''

ایمان باللہ اور توحید کے ذکر کے بعد آیت ۶ میں رسالت اور رسالت کے ضمن میں نوعِ انسانی کو جو سب سے بڑی ٹھوکر لگتی ہے' اس کا ذکر ہوا ہے۔ اس دنیا میں جو بھی پیغمبر آئے تو ان کی قوم کی طرف سے ان کو جھٹلایا گیا' ان کی بات نہیں مانی گئی اور بہت سوں کو ہلاک بھی کر دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی:

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑥

''یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں از خود) محمود۔''

اس حوالے سے سورۃ الفرقان میں ہم کفار کا یہ قول پڑھ آئے ہیں: ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ﴾ (آیت ۷) ''یہ کیسا پیغمبر ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے!'' لہٰذا رسولوں کی بشریت اس دَور کے لوگوں کے لیے ان کو رسول ماننے کی راہ کی رکاوٹ بن گئی۔ دوسری جانب جنہوں نے ان کو اللہ کا رسول مان لیا ان میں سے بھی کچھ لوگوں نے بعد میں ان کو بشریت سے نکال کر الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس لحاظ سے یہ ایک ہی مرض کی دو صورتیں ہیں۔ یعنی پہلے لوگوں نے کہا کہ بشر رسول کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ بعد کے لوگوں نے کہا کہ رسول بشر کیسے ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد آیت ۷ میں خاص طور پر قیامت کا ذکر بڑے زوردار انداز میں ہوا ہے۔ اس آیت میں اس کے انکار کی پُرزور نفی اور اس کے وقوع کا نہایت تاکیدی اثبات فرمایا گیا ہے:

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑦

> ”کافروں کو مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ یہ (موت کے بعد) اٹھائے نہ جائیں گے۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ کیوں نہیں! اور میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تمہیں جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔ اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔“

بعدازاں آیت ۸ میں تینوں ایمانیات کا ذکر کر کے بڑے پیارے انداز میں ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ اس حوالے سے فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝۸

> ”تو ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسولؐ پر، اور اُس نور (قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ اور اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔“

سورۃ کے دوسرے رکوع میں ایمان کے پانچ بنیادی لوازم بیان ہوئے ہیں اور ہمارے حوالے سے یہ بڑا اہم موضوع ہے۔ اس کی بنیاد پر ہم اپنا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایمان کی کوئی رمق ہے یا نہیں؟ پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ دنیا میں ہم پر اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو وہ اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آتی۔ جس کو اللہ پر ایمان ہوتا ہے اس کے دل کو اطمینان اور سکون رہتا ہے، وہ پریشان نہیں ہوتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ بلکہ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میرے رب نے کیا ہے میں اُس پر راضی ہوں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۱۱﴾ ”نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے۔ اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے“۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تم اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہو تو پھر ان کی اطاعت بھی کرنی ہو گی۔ اگر اطاعت نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے کہ تم حقیقتاً مانتے نہیں ہو اور جھوٹا دعویٰ کرتے ہو۔ فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۱۲﴾ ”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول (ﷺ) کی۔ پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان رکھو کہ) ہمارے رسول پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے“۔ تیسری بات یہ ہے کہ اہل ایمان کو اللہ کی ذات پر توکل رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۳﴾ ”اللہ وہ ہستی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس اہل ایمان کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

چوتھی اور پانچویں چیز یہ ہے کہ دنیا میں انسان کے دل میں جن چیزوں کی محبت در آتی ہے وہ بڑے خطرے کے نشان (red signals) ہیں۔ یہ محبتیں مثلاً بیوی، اولاد اور مال کی محبت اگر حد اعتدال سے ذرا تجاوز کریں گی تو وہ فتنہ بن جائیں گی اور عاقبت برباد کر دیں گی۔ اس لیے کہ انہی کی خاطر انسان دنیا میں جھوٹ بولتا ہے، رشوت لیتا اور دیتا ہے، حرام خوریاں کرتا ہے، لہٰذا ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں یہ بات ہمیشہ مستحضر رہے کہ یہ تو صرف آزمائش اور کسوٹی ہے کہ جس میں تمہیں کسا جا رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

اَجْرٌ عَظِيْمٌ⑮

''اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے بچ کر رہو، اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔''

اس کے بعد آخری تین آیات میں ایمان کے مندرجہ بالا پانچ بنیادی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی تاکیدی دعوت ہے۔ فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ⑯

''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہارے بس میں ہے، اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں جتنا خرچ کر سکتے ہو، اس لیے کہ) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور جو جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

سُورۃُ الطَّلَاق

اب یہاں سے زیرِ مطالعہ مدنی گلدستے کا آخری جوڑا شروع ہو رہا ہے جو سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں میں عائلی زندگی کی دو انتہاؤں سے بحث کی گئی ہے۔ عائلی زندگی کی ایک انتہا یہ ہے کہ جب میاں بیوی کے مابین موافقت نہ ہو اور علیحدگی تک نوبت پہنچ جائے۔ یہ موضوع سورۃ الطلاق میں بیان ہوا ہے، جبکہ دوسری انتہا یہ ہے کہ میاں بیوی کے مابین محبت اتنی گہری ہو جائے کہ اس کے سبب اللہ کے احکام توڑے جائیں۔ اس حوالہ سے سورۃ التحریم میں بات ہوئی ہے۔ اس طرح ان دونوں سورتوں کی حیثیت ایک جوڑے کی ہے۔ سورۃ الطلاق کا بنیادی موضوع طلاق اور اس کے متعلقات ہیں۔ اس حوالے سے پہلی آیت میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا①

''اے پیغمبرؐ (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو۔ اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے۔ نہ تو تم ہی ان کو (ایامِ عدت میں) ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں، سوائے اس کے کہ وہ صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں، اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ (اے طلاق دینے والے!) تجھے کیا معلوم شاید اللہ اس کے بعد کوئی (رجعت کی) راہ پیدا کر دے۔''

طلاق کے ضمن میں آیت ۲ اور ۳ میں یہ بتا دیا گیا کہ اگر انسان اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس معاملے میں بھی کوئی راہ نکال دے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

’’پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کے قریب پہنچ جائیں پھر یا تو ان کو اچھی طرح سے (زوجیت میں) رہنے دو یا اچھی طرح سے علیحدہ کر دو اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ کر لو اور (اے گواہو) اللہ کے لیے درست گواہی دینا۔ ان باتوں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ اُس کے لیے (رنج و محن سے) مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اور اُس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اور جو شخص اللہ پر توکّل کرے تو (اللہ) اس کے لیے کافی ہے۔ یقیناً اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے۔ یقیناً اللہ نے ہر شے کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔‘‘

آیت ۴ میں عدت کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے فرمایا:

وَالّٰٓـیْٔ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـیْٔ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾

’’اور تمہاری (مطلقہ) عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا (ان کی عدت بھی یہی ہے)۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔ اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا۔‘‘

اس کے بعد آیت ۶ میں مطلقہ عورت کو عدت کے دوران نفقہ اور مرضعہ کو اجرت دینے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ﴿۶﴾

’’(مطلقہ) عورتوں کو (ایامِ عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ دو۔ اور اگر حمل سے ہوں تو بچہ جننے تک ان کا خرچ دیتے رہو۔ پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے سے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو اور (بچے کے بارے میں) پسندیدہ طریق سے موافقت رکھو، اور اگر باہم ضد (اور نااتفاقی) کرو گے تو (بچے کو) اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور

عورت دودھ پلائے گی۔"

اس کے بعد آیت ۱۰ اور ۱۱ میں اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن اور بعثتِ محمدی ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾

"(اے اہلِ ایمان!) اللہ نے تمہارے لیے یہ "الذکر" نازل کر دیا ہے۔ (اور اپنا) پیغمبر ﷺ (بھی بھیجا ہے) جو تمہارے سامنے اللہ کی واضح المطالب آیتیں پڑھتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور جو شخص ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کو باغ ہائے بہشت میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ہمیشہ ہمیش ان میں رہیں گے۔ یقیناً اللہ نے ان کو خوب رزق دیا ہے۔"

سُورۃُ التَّحرِیْم

اس جوڑے کی دوسری سورۃ "التحریم" ہے۔ جیسے ماقبل بیان ہوا کہ اس سورۃ میں میاں بیوی کے حوالے سے دوسری انتہا کا ذکر ہے جب زوجین میں ایسی محبت پیدا ہو جائے کہ احکاماتِ الٰہیہ ٹوٹنے لگیں۔ سورۃ التحریم کی پہلی آیت ملاحظہ ہو:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱﴾

"اے پیغمبر (ﷺ)! جو چیز اللہ نے تمہارے لیے جائز کی ہے تم اس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو؟ کیا (اس سے) اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو؟ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے تو اس کا (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ) کوئی امکان نہیں تھا کہ اللہ کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال کر لیں، البتہ یہ ضرور تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعض ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہن) کی رضا جوئی کے لیے ایک حلال چیز پر قسم کھالی تھی کہ آئندہ میں اسے نہیں کھاؤں گا۔ اس پر تھوڑی گرفت ہوگئی کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

اس کے بعد آیات ۳ تا ۵ میں نبی اکرم ﷺ کی عائلی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ نے اپنی کسی زوجہ رضی اللہ عنہا سے کوئی راز کی بات کہی۔ ان زوجہ سے غلطی ہوئی اور انہوں نے کسی دوسری زوجہ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو اس افشائے راز کی خبر دے دی۔ آپؐ نے شکوہ اور شکایت میں بھی التفات اور ملائمت کے پہلو کو پیش نظر رکھا تاکہ ان زوجہ محترمہ کو انتباہ ہو جائے۔ چنانچہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ

وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۳

’’اور جب نبی (ﷺ) نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی' پھر جب اُس بیوی نے وہ راز (کسی اور پر) ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبی (ﷺ) کو اُس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی (ﷺ) نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (ﷺ) نے کہا'' مجھے اُس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا اور خوب باخبر ہے۔‘‘

آیت ۶ میں اہلِ ایمان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے اہل و عیال کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کریں۔ اس ضمن میں عائلی زندگی کے حوالے سے یہ نکتہ نوٹ کر لیں کہ اولاد اور بیویوں سے محبت اپنی جگہ ایک حد تک مطلوب ہے لیکن اگر اس حد سے آگے بڑھو گے تو پھر یہ ایک فتنہ ہے۔ چنانچہ آیت ۶ میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝۶

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے' جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر' اور جس پر بہت تند خو اور سخت دل فرشتے مامور ہیں جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے وہ بجا لاتے ہیں۔‘‘

اس آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی گئی ہے کہ سربراہ کی ذمہ داری اپنی بیوی بچوں کو صرف نان و نفقہ فراہم کرنے کی نہیں ہے بلکہ ان کو جہنم کی آگ سے بچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

آیت ۸ میں فرمایا گیا کہ اگر ابھی تک کوئی کوتاہی ہوتی رہی ہے' کسی غلط راستہ پر چلتے رہے ہو تو اللہ کی جناب میں خلوص کے ساتھ توبہ کرو۔ یعنی دھوکہ بازی اور دکھاوے کی توبہ نہ ہو کہ توبہ بھی ہو رہی ہو اور کام بھی سارے وہی غلط ہو رہے ہوں۔ اگر اخلاص کے ساتھ اور اس عہد کے ساتھ توبہ کرو گے کہ آئندہ ہم غلط حرکتوں کا ارتکاب نہیں کریں گے تو اللہ تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۸

’’اے اہلِ ایمان! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اس روز اللہ اپنے نبی (ﷺ) اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے دائیں جانب

(بقیہ صفحہ 69 پر)

فہمُ القُرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سُورۃُ النِّساء

آیات ۷۱ تا ۷۴

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا۝ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِیْدًا۝ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَیَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ یّٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا۝ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۝

ن ف ر

نَفَرَ۔ یَنْفِرُ (ض) نَفْرًا : (۱) کسی اہم کام کے لیے نکلنا، جیسے سفر یا جنگ کے لیے۔ ﴿وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ﴾ (التوبۃ: ۸۱) ''اور انہوں نے کہا مت نکلو گرمی میں۔ آپ کہہ دیجیے جہنم زیادہ سخت ہے بلحاظ گرمی کے۔'' (۲) نَفَرَ عَنْهُ : کسی چیز سے دور بھاگنا، بدکنا، نفرت کرنا۔

اِنْفِرْ (فعل امر) : تو نکل۔ آیت زیر مطالعہ۔

نُفُوْرٌ (نَفَرَ یَنْفِرُ سے مصدر) : انتہائی بیزاری، نفرت۔ ﴿وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۝۴۱﴾ (بنی اسراء یل) ''اور یہ زیادہ نہیں کرتا ان کو مگر نفرت میں۔''

نَفَرٌ: کسی کام کے لیے نکلنے والی چھوٹی جماعت۔ پھر ہر چھوٹی جماعت کے لیے عام ہے: ﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ﴾ (الاحقاف: ۲۹) ''اور جب ہم نے پھیرا آپ کی طرف جنوں میں سے ایک جماعت کو۔''

نَفِیْرٌ: مستقل جماعت، جتھا۔ ﴿وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا۝۶﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور ہم نے تمہاری مدد کی مال سے اور بیٹوں سے اور ہم نے کر دیا تم کو سب سے زیادہ بطور جتھے کے۔‘‘

اِسْتَنْفَرَ - يَسْتَنْفِرُ (استفعال) اِسْتِنْفَارًا : ڈر کر بھاگ جانا‘ بدکنا۔

مُسْتَنْفِرٌ (اسم الفاعل) : بدکنے والا۔ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝٥٠﴾ (المدثر) ’’گویا کہ وہ بدکنے والے گدھے ہیں۔‘‘

ث ب ی

ثَبٰى - يَثْبِيْ (ض) ثَبْيًا : جمع کرنا‘ اکٹھا کرنا۔

ثُبَةٌ ج ثُبَاتٌ : اکٹھا کیا ہوا گروہ‘ جماعت‘ آیت زیر مطالعہ۔

ب ط ء

بَطُأَ - يَبْطُؤُ (ک) بِطَاءً : سست ہونا‘ دیر لگانا۔

بَطَّأَ - يُبَطِّؤُ (تفعیل) تَبْطِيْئًا : (۱) عمداً دیر لگانا۔ (۲) دوسروں کو سست کرنا‘ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ’’ثُبَاتٍ‘‘ اور ’’جَمِيْعًا‘‘ دونوں حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ ’’شَهِيْدًا‘ كَانَ‘‘ کی خبر ہے۔ ’’لَيَقُوْلَنَّ‘‘ کا مقولہ ’’يٰلَيْتَنِيْ‘‘ سے ’’فَوْزًا عَظِيْمًا‘‘ تک ہے۔ درمیان میں ’’كَاَنْ لَّمْ‘‘ سے ’’مَوَدَّةٌ‘‘ تک جملہ معترضہ ہے۔ ’’مَوَدَّةٌ‘‘ مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور ’’تَكُنْ‘‘ کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوا ہے‘ جبکہ اس کی خبر ’’مَوْجُوْدًا‘‘ محذوف ہے۔ ’’فَاَفُوْزَ‘‘ کا فا سببیہ ہے جس نے مضارع کو نصب دی ہے۔ ’’فَلْيُقَاتِلْ‘‘ فعل امر غائب ہے اور اس کا فاعل ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ ہے۔ ’’وَمَنْ يُّقَاتِلْ‘‘ کا ’’مَنْ‘‘ شرطیہ ہے اور ’’يُقَاتِلْ‘‘ شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ ’’نُؤْتِيْهِ‘‘ جواب شرط ہے‘ لیکن ’’سَوْفَ‘‘ آ جانے کی وجہ سے مجزوم نہیں ہوا۔ اگر ’’سَوْفَ‘‘ نہ آتا تو پھر یہ مجزوم ہو کر ’’نُؤْتِهِ‘‘ آتا۔

ترجمہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو
اٰمَنُوْا : ایمان لائے
خُذُوْا : تم لوگ پکڑو
حِذْرَكُمْ : اپنے بچاؤ کے ہتھیار کو
فَانْفِرُوْا : پھر تم لوگ نکلو
ثُبَاتٍ : گروہ در گروہ
اَوِ : یا
انْفِرُوْا : تم لوگ نکلو
جَمِيْعًا : سب اکٹھا
وَاِنَّ : اور یقیناً
مِنْكُمْ : تم میں سے
لَمَنْ : وہ بھی ضرور ہے جو
لَّيُبَطِّئَنَّ : لازماً دیر لگائے گا
فَاِنْ : پھر اگر
اَصَابَتْكُمْ : آن لگی تم کو
مُّصِيْبَةٌ : کوئی مصیبت
قَالَ : تو وہ کہے گا
قَدْ اَنْعَمَ : انعام کیا ہے
اللّٰهُ : اللہ نے
عَلَيَّ : مجھ پر

اِذْ :جب
لَمْ اَكُنْ :میں نہیں تھا
مَّعَهُمْ :ان کے ساتھ
شَهِيْدًا :موقع پر موجود
وَلَئِنْ :اور البتہ اگر
اَصَابَكُمْ :آن لگے تم کو
فَضْلٌ :کوئی فضل
مِّنَ اللّٰهِ :اللہ (کے پاس) سے
لَيَقُوْلَنَّ :تو وہ لازماً کہے گا
كَاَنْ :جیسے کہ
لَّمْ تَكُنْ :تھی ہی نہیں
بَيْنَكُمْ :تمہارے درمیان
وَبَيْنَهٗ :اور اس کے درمیان
مَوَدَّةٌ :کوئی خیر خواہی
يّٰلَيْتَنِيْ :اے کاش
كُنْتُ :میں ہوتا
مَعَهُمْ :ان کے ساتھ
فَاَفُوْزَ :تب تو میں کامیابی پاتا
فَوْزًا عَظِيْمًا :ایک شاندار کامیابی
فَلْيُقَاتِلْ :پس چاہیے کہ جنگ کریں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اللہ کی راہ میں
الَّذِيْنَ :وہ لوگ جنہوں نے
يَشْرُوْنَ :بیچ دیا
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا :دنیا کی زندگی کو
بِالْاٰخِرَةِ :آخرت کے بدلے
وَمَنْ :اور جو
يُّقَاتِلْ :جنگ کرے گا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اللہ کی راہ میں
فَيُقْتَلْ :پھر وہ قتل کیا گیا
اَوْ :یا
يَغْلِبْ :غالب آیا
فَسَوْفَ :تو عنقریب
نُؤْتِيْهِ :ہم دیں گے اس کو
اَجْرًا عَظِيْمًا :ایک شاندار بدلہ

آیات ۷۵۔۷۶

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۷۵) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (۷۶)

ترکیب :''فِيْ سَبِيْلِ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ'' حالت جر میں آیا ہے اور یہ اسم المفعول ہے۔ ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ ''اَلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ'' شرح ہے ''اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ'' کی۔ ''كَانَ ضَعِيْفًا'' آفاقی صداقت کا بیان ہے اس لیے ''كَانَ'' کا ترجمہ حال میں ہوگا۔

ترجمہ:

وَمَا لَكُمْ :تمہیں کیا ہے
لَا تُقَاتِلُوْنَ :(کہ) تم لوگ جنگ نہیں کرتے

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ :اللہ کی راہ میں
مِنَ الرِّجَالِ :مَردوں میں سے
وَالْوِلْدَانِ :اور بچوں میں سے
یَقُوْلُوْنَ : کہتے ہیں
اَخْرِجْنَا :تو نکال ہم کو
الظَّالِمِ : ظالم ہیں
وَاجْعَلْ :اور تو بنا
مِنْ لَّدُنْکَ :اپنے پاس سے
وَّاجْعَلْ :اور تو بنا
مِنْ لَّدُنْکَ :اپنے پاس سے
اَلَّذِیْنَ :جولوگ
یُقَاتِلُوْنَ :وہ لوگ جنگ کرتے ہیں
وَالَّذِیْنَ :اور جنہوں نے
یُقَاتِلُوْنَ :وہ لوگ جنگ کرتے ہیں
فَقَاتِلُوْٓا :پس تم لوگ جنگ کرو
اِنَّ :یقیناً
کَانَ ضَعِیْفًا: کمزور (ہوتی) ہے

وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ : اور کمزور کیے ہوئے لوگوں کے لیے
وَالنِّسَآءِ :اور عورتوں میں سے
الَّذِیْنَ :جولوگ
رَبَّنَآ :اے ہمارے ربّ
مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ :اس بستی سے
اَھْلُھَا :جس کے لوگ
لَّنَا :ہمارے لیے
وَلِیًّا :کوئی کارساز
لَّنَا :ہمارے لیے
نَصِیْرًا :کوئی مددگار
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ :اللہ کی راہ میں
کَفَرُوْا :کفر کیا
فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ :طاغوت کی راہ میں
اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ :شیطان کے کارندوں سے
کَیْدَ الشَّیْطٰنِ :شیطان کی چالبازی

نوٹ ۱ : تاریخ انسانیت شاہد ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کی محدود بصیرت اور خواہشاتِ نفس پر مبنی جب بھی کوئی سوشل آرڈر رائج ہوا ہے تو اس کا نتیجہ وہ نکلا ہے جس کی طرف زیر مطالعہ آیت ۷۵ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان، انسان پر بالادستی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے کو زمین کے ذرائع اور وسائل سے محروم کر دیتا ہے اور معاشرے میں انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا توازن بگڑ جاتا ہے، جسے قرآن میں فساد کہا گیا ہے۔

آیت ۷۶ میں بتایا گیا ہے کہ طاغوتی طاقتوں نے ہمیشہ اپنے خودساختہ سوشل آرڈر کی برتری کے لیے جنگ کی ہے، آج بھی کر رہی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ اہل ایمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس سوشل آرڈر کی برتری کے لیے جنگ کریں جو انسان کے مصوّر (designer) اور خالق کا دیا ہوا ہے، جس میں معاشرے کے ہر طبقے کے حقوق و فرائض کے توازن کی ضمانت ہے اور یہی توازن دنیا میں حقیقی امن و سکون کا ضامن ہے۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

آیت ۷۶ میں اس آفاقی صداقت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ شیطان کی سکھائی ہوئی طاغوتی چالیں ہمیشہ

کمزور رہی ہیں اور کمزور رہیں گی' البتہ اس کے لیے دو شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اولاً یہ کہ یہ چالیں اہل ایمان کے مقابلے پر ہوں اور ثانیاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے سوشل آرڈر کی برتری کے خلاف ہوں۔ ان دونوں شرطوں میں سے کوئی ایک بھی اگر فوت ہو جائے تو پھر شیطان کی تدبیر کا کمزور ہونا ضروری نہیں ہے۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

نوٹ ۲: دونوں شرائط کی موجودگی میں بھی مذکورہ صداقت کے صحیح ادراک کے لیے ذہن میں یہ پہلو بھی واضح ہونا چاہیے کہ شیطانی چالوں کا کمزور ہونا فوری نتائج کے اعتبار سے نہیں بلکہ انجام کار کے لحاظ سے ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ اللہ کے دین (سوشل آرڈر) کی سربلندی کے لیے لڑی جانے والی کچھ جنگوں میں اہل ایمان نے ہار کر بھی بازی جیتی ہے۔ جنگ احد کی شکست فتح مکہ پر منتج ہوئی ہے۔ جنگ موتہ میں رومیوں کی فتح ان کی ایمپائر کے زوال کا سبب بنی ہے۔ خلافت عباسیہ کے آخری دور میں مذکورہ دونوں شرطیں پوری طرح موجود نہیں تھیں' پھر بھی شیطان کو اس نام نہاد خلافت کا وجود گوارا نہ تھا۔ اس نے تاتار کے ہاتھوں اسے ختم کرانے کی تدبیر کی اور اللہ نے اس کی تدبیر کو کامیاب ہونے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس وقت اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا' اور شیطان تو کیا جانتا کہ یہ بغداد کا تاراج ہونا دراصل خلافت عثمانیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب ہے۔ اس لیے طاغوت کی کسی وقتی کامیابی کو اس آفاقی صداقت کا استثنا قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔

آیات ۷۷ تا ۷۹

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۝ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ ؕ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ھٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا ۝ مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ ؕ وَاَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ۝

ب ر ج

بَرِجَ ۔ یَبْرَجُ (س) بَرَجًا: (۱) خوبصورت آنکھوں والا ہونا۔ (۲) کسی چیز کا نمایاں ہونا' بلند ہونا۔

بُرْجٌ ج بُرُوْجٌ: (۱) گنبد' مینار' آیت زیر مطالعہ۔ (۲) آسمان میں سیاروں کی منزلیں: ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَاءِ بُرُوْجًا﴾ (الحجر:۱۶) ''اور ہم نے بنائی ہیں آسمان میں منزلیں۔''

تَبَرَّجَ ۔ یَتَبَرَّجُ (تفعل) تَبَرُّجًا: بتکلف خود کو نمایاں کرنا: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی﴾

(الاحزاب:۳۳) ''اور تم عورتیں خود کو نمایاں مت کرو، سابقہ جاہلیت کا نمایاں کرنا۔''

مُتَبَرِّجٌ (اسم الفاعل) : نمایاں کرنے والا: ﴿فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ﴾ (النور: ٦٠) ''تو نہیں ہے ان عورتوں پر کوئی گناہ کہ وہ اتار رکھیں اپنی اوڑھنیاں بغیر نمایاں کرنے والیاں ہوتے ہوئے زینت کو۔''

ش ی د

شَادَ ۔ يَشِيْدُ (ض) شَيْدًا : عمارت کو بلند کرنا، پلستر کر کے مضبوط کرنا، نقش و نگار بنا کر مزین کرنا۔

مَشِيْدٌ (مَفْعِلٌ کے وزن پر اسم الظرف) : پلستر کرنے یا نقش و نگار بنانے کی جگہ۔ پھر عام طور پر اسم المفعول کے معنی میں آتا ہے۔ مضبوط کیا ہوا، مزین کیا ہوا: ﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۴۵﴾ (الحج) ''تو وہ اوندھی پڑی ہیں اپنی چھتوں پر، اور معطل کیے ہوئے کنویں اور مزین کیے ہوئے محل۔''

شَيَّدَ يُشَيِّدُ (تفعیل) تَشْيِيْدًا : کثرت سے مضبوط یا مزین کرنا۔

مُشَيَّدٌ (اسم المفعول) : خوب مضبوط کیا ہوا، آیت زیر مطالعہ۔

ف ق ه

فَقِهَ ۔ يَفْقَهُ (س) فِقْهًا : کسی علم حاضر کے ذریعے اس کے علم غائب تک پہنچنا، بات کے ہر پہلو کا احاطہ کر کے سمجھنا، آیت زیر مطالعہ۔

تَفَقَّهَ ۔ يَتَفَقَّهُ (تفعل) تَفَقُّهًا : کسی چیز میں بتکلف سوجھ بوجھ حاصل کرنا: ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ (التوبة:۱۲۲) ''پھر کیوں نہ نکلی ان کے ہر گروہ سے ایک جماعت تاکہ وہ لوگ سوجھ بوجھ حاصل کریں دین میں۔''

د ر ك

ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

دَرَكٌ : کسی کا لاحق ہونا، پکڑے جانا: ﴿لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۷۷﴾ (طٰہٰ) ''آپؑ کو خوف نہیں ہو گا پکڑے جانے کا اور نہ آپؑ کو ڈر ہو گا (ڈوبنے کا)۔''

دَرْكٌ : نشیب، گہرائی: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء:۱۴۵) ''یقیناً منافق لوگ سب سے نچلی گہرائی میں ہوں گے آگ میں سے۔''

اَدْرَكَ ۔ يُدْرِكُ (افعال) اِدْرَاكًا : کسی چیز کا اپنی غایت تک پہنچنا، جیسے پھل کا پکنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں آتا ہے۔ (۱) پا لینا۔ (۲) آ پکڑنا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ﴾ (الانعام:۱۰۳) ''نہیں پاتیں اس کو آنکھیں اور وہ پا لیتا ہے آنکھوں کو''۔ ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ﴾ (یٰسٓ:۴۰) ''سورج کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ آ پکڑے چاند کو۔''

مُدْرَكٌ (اسم المفعول) : پکڑا ہوا: ﴿قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۶۱﴾ (الشعراء) ''کہا موسٰیؑ کے ساتھیوں نے بے شک ہم تو پکڑے ہوئے ہیں۔''

تَدَارَكَ۔ يَتَدَارَكُ (تفاعل) تَدَارُكًا اور اِدَّارُكًا: باہم ایک دوسرے کو پالینا' آ ملنا: ﴿حَتّٰى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ﴾ (الاعراف: ۳۸) ''یہاں تک کہ جب وہ لوگ آ ملے اس میں سب کے سب۔''

ترکیب: ''فَرِيْقٌ'' اسم الجمع ہے' اس لیے فعل ''يَخْشَوْنَ'' جمع آیا ہے۔ ''اَشَدَّ'' حال ہے ''خَشْيَةً'' اس کی تمیز ہے۔ ''تُظْلَمُوْنَ'' کا نائب فاعل ''وْ'' ضمیر ہے اور ''فَتِيْلًا'' تمیز ہے۔ ''اَيْنَ مَا'' شرطیہ ہے اور ''يُدْرِكْ'' اس کا جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ ''اَلْمَوْتُ'' اس کا فاعل ہے۔ ''فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ'' دراصل ''فَمَا لِهٰٓؤُلَاۗءِ'' ہے۔ جیسے ''فَمَالَكُمْ'' یا ''فَمَالَنَا'' ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے کہ ''هٰٓؤُلَاۗءِ'' کی لام جر کو ''فَمَا'' کے ساتھ ملا کر لکھا گیا ہے۔ ''اَرْسَلْنَا'' کا مفعول اس کے ساتھ ضمیر ''كَ'' ہے اور ''رَسُوْلًا'' حال ہے۔

ترجمہ:

اَلَمْ تَرَ: کیا آپؐ نے غور نہیں کیا
اِلَى الَّذِيْنَ: ان لوگوں کی طرف
قِيْلَ: کہا گیا
لَهُمْ: جن سے
كُفُّوْٓا: کہ تم لوگ روکے رکھو
اَيْدِيَكُمْ: اپنے ہاتھوں کو
وَاَقِيْمُوا: اور قائم کرو
الصَّلٰوةَ: نماز کو
وَاٰتُوا: اور پہنچاؤ
الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ کو
فَلَمَّا: پھر جب
كُتِبَ: فرض کیا گیا
عَلَيْهِمُ: ان پر
الْقِتَالُ: جنگ کرنے کو
اِذَا: تب ہی
فَرِيْقٌ: ایک فریق
مِّنْهُمْ: ان میں سے
يَخْشَوْنَ: ڈرتا ہے
النَّاسَ: لوگوں سے
كَخَشْيَةِ اللّٰهِ: اللہ سے ڈرنے کی مانند
اَوْ: یا
اَشَدَّ: زیادہ سخت ہوتے ہوئے
خَشْيَةً: بلحاظ ڈر کے
وَقَالُوْا: اور انہوں نے کہا
رَبَّنَا: اے ہمارے ربّ
لِمَ: کیوں
كَتَبْتَ: تو نے فرض کیا
عَلَيْنَا: ہم پر
الْقِتَالَ: جنگ کرنا
لَوْلَآ: کیوں نہیں
اَخَّرْتَنَآ: تو نے مؤخر کیا ہم کو
اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ: ایک قریبی مدت تک
قُلْ: آپؐ کہیے
مَتَاعُ الدُّنْيَا: دنیا کا سامان
قَلِيْلٌ: تھوڑا ہے
وَالْاٰخِرَةُ: اور آخرت
خَيْرٌ: بہتر ہے
لِّمَنِ: اس کے لیے جس نے
اتَّقٰى: تقویٰ کیا
وَلَا تُظْلَمُوْنَ: اور تم لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا

فَتِيْلاً : کسی دھاگے برابر بھی	اَيْنَ مَا : جہاں کہیں بھی
تَكُوْنُوْا : تم ہو گے	يُدْرِكْكُّمُ : آئے گی تم کو
الْمَوْتُ : موت	وَلَوْ : اور اگر
كُنْتُمْ : تم ہو	فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ : کسی انتہائی مضبوط گنبد میں
وَاِنْ تُصِبْهُمْ : اور اگر آ لگے ان کو	حَسَنَةٌ : کوئی بھلائی
يَّقُوْلُوْا : تو وہ کہتے ہیں	هٰذِهٖ : یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ : اللہ کے پاس سے ہے	وَاِنْ تُصِبْهُمْ : اور اگر آ لگے ان کو
سَيِّئَةٌ : کوئی برائی	يَّقُوْلُوْا : تو وہ کہتے ہیں
هٰذِهٖ : یہ	مِنْ عِنْدِكَ : آپؐ کے پاس سے ہے
قُلْ : آپؐ کہیے	كُلٌّ : سب کچھ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ : اللہ کے پاس سے ہے	فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ : تو کیا ہے اس قوم کے لیے
لَا يَكَادُوْنَ : قریب نہیں ہے	يَفْقَهُوْنَ : کہ وہ سمجھیں
حَدِيْثًا : کوئی بات	مَآ اَصَابَكَ : جو آ لگے تجھ کو
مِنْ حَسَنَةٍ : کوئی بھی بھلائی	فَمِنَ اللّٰهِ : تو (وہ) اللہ کے پاس سے ہے
وَمَآ اَصَابَكَ : اور جو آ لگے تجھ کو	مِنْ سَيِّئَةٍ : کوئی بھی برائی
فَمِنْ نَّفْسِكَ : تو (وہ) تیرے نفس سے ہے	وَاَرْسَلْنٰكَ : اور ہم نے بھیجا آپؐ کو
لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے	رَسُوْلاً : رسول ہوتے ہوئے
وَكَفٰى بِاللّٰهِ : اور کافی ہے اللہ	شَهِيْدًا : بطور گواہ

آیات ۸۰ تا ۸۳

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ وَيَقُوْلُوْنَ
طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا
يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ
وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ
اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ذ ی ع

ذَاعَ۔ يَذِيْعُ (ض) ذِيْعًا : کسی چیز کا پھیلنا‘ جیسے بدن میں کھجلی پھیلنا‘ بستی میں خبر پھیلنا۔

اَذَاعَ ۔ يُذِيْعُ (افعال) اِذَاعَةً : خبر پھیلنا‘ راز فاش کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ن ب ط

نَبَطَ ۔ يَنْبُطُ ويَنْبِطُ (ن۔ض) نَبْطًا : کسی چیز سے پانی کا پھوٹ نکلنا۔

اِسْتَنْبَطَ يَسْتَنْبِطُ (استفعال) اِسْتِنْبَاطًا : کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا۔ جیسے کنواں کھود کر پانی نکالنا۔ اجتہاد کر کے کسی بات کے باطن کو نمایاں کرنا۔ حقیقت معلوم کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ’’طَاعَةٌ‘‘ اگر ’’يَقُوْلُوْنَ‘‘ کا مفعول ہوتا تو ’’طَاعَةً‘‘ آتا‘ اس لیے یہ ’’يَقُوْلُوْنَ‘‘ کا مقولہ ہے اور direct tense میں آیا ہے۔ ’’بَيَّتَ‘‘ کا فاعل ’’طَائِفَةٌ‘‘ ہے جو عاقل کی جمع مکسر ہے۔ اس لیے اس کا فعل واحد مذکر کے صیغے میں بھی جائز ہے۔ ’’تَقُوْلُ‘‘ کا فاعل اس میں ’’هِيَ‘‘ کی ضمیر ہے جو ’’طَائِفَةٌ‘‘ کے لیے ہے۔ ’’لَعَلِمَهُ‘‘ میں لام جوابِ شرط کا ہے اور فعل ’’عَلِمَ‘‘ کا مفعول ’’ہٗ‘‘ کی ضمیر ہے‘ جبکہ اس کا فاعل ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ ہے۔ ’’وَلَوْلَا‘‘ میں ’’لَوْ‘‘ شرطیہ ہے۔ ’’فَضْلُ اللّٰهِ‘‘ اور ’’رَحْمَتُهٗ‘‘ مبتدأ ہیں اور ان کی خبر محذوف ہے۔

ترجمہ:

مَنْ: جو
يُّطِعِ: اطاعت کرتا ہے
الرَّسُوْلَ: رسولؐ کی
فَقَدْ اَطَاعَ: تو اس نے اطاعت کی ہے
اللّٰهَ: اللہ کی
وَمَنْ: اور جو
تَوَلّٰى: منہ موڑتا ہے
فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ: تو ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو
عَلَيْهِمْ: ان پر
حَفِيْظًا: نگران بنا کر
وَيَقُوْلُوْنَ: اور وہ لوگ کہتے ہیں
طَاعَةٌ: فرمانبرداری ہے
فَاِذَا: پھر جب
بَرَزُوْا: وہ نکلتے ہیں
مِنْ عِنْدِكَ: آپؐ کے پاس سے
بَيَّتَ: تو رات میں مشورہ کرتا ہے
طَآئِفَةٌ: ایک گروہ
مِّنْهُمْ: ان میں سے
غَيْرَ الَّذِىْ: اس کے علاوہ جو
تَقُوْلُ: آپ کہتے ہیں
وَاللّٰهُ: اور اللہ
يَكْتُبُ: لکھتا ہے
مَا: اس کو جو
يُبَيِّتُوْنَ: وہ لوگ رات میں مشورہ کرتے ہیں
فَاَعْرِضْ: تو آپؐ اعراض کریں
عَنْهُمْ: ان سے
وَتَوَكَّلْ: اور بھروسہ کریں
عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر
وَكَفٰى: اور کافی ہے
بِاللّٰهِ: اللہ

وَكِيْلًا: بطور کارساز کے
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ: تو کیا یہ لوگ غور وفکر نہیں کرتے
الْقُرْاٰنَ: قرآن میں
وَلَوْ: اور اگر
كَانَ: وہ ہوتا
مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ: غیر اللہ کے پاس سے
لَوَجَدُوْا: تو یہ پاتے
فِيْهِ: اس میں
اخْتِلَافًا كَثِيْرًا: بہت زیادہ اختلاف
وَاِذَا: اور جب بھی
جَآءَ: آتی ہے
هُمْ: ان کے پاس
اَمْرٌ: کوئی بات
مِّنَ الْاَمْنِ: امن میں سے
اَوِ الْخَوْفِ: یا خوف میں سے
اَذَاعُوْا: تو وہ لوگ چرچا کرتے ہیں
بِهٖ: اس کا
وَ: حالانکہ
لَوْ: اگر
رَدُّوْهُ: وہ لوٹا دیتے اس کو
اِلَى الرَّسُوْلِ: رسولؐ کی طرف
وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ: اور اختیار والوں کی طرف
مِنْهُمْ: اپنوں میں سے
لَعَلِمَهُ: تو علم حاصل کرتے اس کا
الَّذِيْنَ: وہ لوگ جو
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ: حقیقت معلوم کر سکتے ہیں اس کی
مِنْهُمْ: ان میں سے
وَلَوْلَا: اور اگر نہ ہوتا
فَضْلُ اللّٰهِ: اللہ کا فضل
عَلَيْكُمْ: تم لوگوں پر
وَرَحْمَتُهٗ: اور اس کی رحمت
لَاتَّبَعْتُمُ: تو تم لوگ پیروی کرتے
الشَّيْطٰنَ: شیطان کی
اِلَّا قَلِيْلًا: سوائے تھوڑے سے لوگوں کے

نوٹ ۱: آیت ۸۲ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے۔ اس لیے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں کا کام ہے۔ البتہ عام لوگوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھ لیں تاکہ غلط فہمی اور مغالطوں سے بچ سکیں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کسی مستند تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کہیں کوئی شبہ پیش آئے تو اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں بلکہ کسی عالم سے رجوع کر لیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۸۳ سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو تحقیق کے بغیر بیان نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔ (بیان القرآن)

آیات ۸۴ تا ۸۷

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ

نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
مُّقِیْتًا ۝٨٥ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ۝٨٦
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ۝٨٧

ح ر ض

حَرِضَ ۔ یَحْرَضُ (س) حَرَضًا : کسی خرابی یا غم سے گھل جانا‘ کمزور ہونا۔

حَرَضٌ (صفت): کمزور‘ لاغر۔ ﴿حَتّٰی تَكُوْنَ حَرَضًا﴾ (یوسف:٨٥) ”یہاں تک کہ آپ ہو جائیں لاغر۔“

حَرَّضَ ۔ یُحَرِّضُ (تفعیل) تَحْرِیْضًا : کمزوری دور کرنا‘ کسی کام پر ابھارنا‘ اُکسانا۔

حَرِّضْ (فعل امر) : تو اکسا‘ آیت زیر مطالعہ۔

ق و ت

قَاتَ ۔ یَقُوْتُ (ن) قَوْتًا : غذا دینا‘ رزق دینا۔

قُوْتٌ ج اَقْوَاتٌ (اسم ذات): غذا‘ روزی: ﴿وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا﴾ (حٰمٓ السجدة: ١٠) ”اور مقدر کیں اس میں اس کی روزیاں۔“

اَقَاتَ ۔ یُقِیْتُ (افعال) اِقَاتَةً : کسی چیز کو روزی بنانے کی قدرت رکھنا۔

مُقِیْتٌ (اسم فاعل) : قدرت رکھنے والا‘ قادر۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ”لَا تُكَلَّفُ“ مضارع مجہول ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں ”اَنْتَ“ کی ضمیر ہے اور ”نَفْسَكَ“ مفعول ثانی ہے۔ ”اَشَدُّ“ افعل تفضیل ہے جبکہ ”بَاْسًا“ اور ”تَنْكِیْلًا“ اس کی تمیز ہیں۔ ”مَنْ یَّشْفَعْ“ شرط ہے اور ”یَكُنْ لَّهٗ“ اس کا جواب شرط ہے۔ ”نَصِیْبٌ“ اور ”كِفْلٌ“ مبتدأ مؤخر نکرہ ہیں اور ”یَكُنْ“ کے اسم ہیں۔ ان کی خبریں محذوف ہیں جو ”وَاجِبًا“ ہو سکتی ہیں‘ ”كَانَ“ کی خبر ”مُقِیْتًا“ ہے۔ ”حُیِّیْتُمْ“ ماضی مجہول ہے۔ ”حَدِیْثًا“ تمیز ہے ”اَصْدَقُ“ کی۔

ترجمہ:

فَقَاتِلْ: پس آپ جنگ کریں	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں
لَا تُكَلَّفُ: آپ کو پابند نہیں کیا جاتا	اِلَّا: سوائے
نَفْسَكَ: آپ کی ذات کے	وَ: اور
حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ: آپ اکسائیں مؤمنوں کو	عَسَی: قریب ہے
اللّٰهُ: اللہ	اَنْ: کہ
یَّكُفَّ: وہ روک دے	بَاْسَ الَّذِیْنَ: ان لوگوں کی جنگ کو جنہوں نے
كَفَرُوْا: کفر کیا	وَاللّٰهُ : اور اللہ
اَشَدُّ: زیادہ شدید ہے	بَاْسًا: سختی کرنے میں
وَّ: اور	اَشَدُّ: زیادہ شدید ہے

تَنْكِيْلًا: عبرت ناک سزا دینے میں
مَنْ يَّشْفَعْ: جو سفارش کرتا ہے
شَفَاعَةً حَسَنَةً: کوئی اچھی سفارش
يَّكُنْ: تو ہو جاتا ہے
لَّهٗ: اس کے لیے
نَصِيْبٌ: ایک حصہ
مِّنْهَا: اس میں سے
وَمَنْ يَّشْفَعْ: اور جو سفارش کرتا ہے
شَفَاعَةً سَيِّئَةً: کوئی بری سفارش
يَّكُنْ: تو ہو جاتی ہے
لَّهٗ: اس کے لیے
كِفْلٌ: ایک ذمہ داری
مِّنْهَا: اس میں سے
وَكَانَ اللّٰهُ: اور اللہ ہے
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ: ہر چیز پر
مُّقِيْتًا: قدرت رکھنے والا
وَاِذَا: اور جب بھی
حُيِّيْتُمْ: تم لوگوں کو سلام کیا جائے
بِتَحِيَّةٍ: کوئی سلام
فَحَيُّوْا: تو تم سلام کرو
بِاَحْسَنَ مِنْهَآ: اس سے زیادہ اچھے سے
اَوْ رُدُّوْهَا: یا لوٹا دو اس کو
اِنَّ اللّٰهَ: یقیناً اللہ
كَانَ: ہے
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ: ہر چیز پر
حَسِيْبًا: حساب لینے والا
اَللّٰهُ: اللہ
لَآ اِلٰهَ: کوئی الٰہ نہیں ہے
اِلَّا: مگر
هُوَ: وہ
لَيَجْمَعَنَّكُمْ: وہ لازماً جمع کرے گا تم لوگوں کو
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن کی طرف
لَا رَيْبَ: کوئی شک نہیں ہے
فِيْهِ: جس میں
وَمَنْ: اور کون
اَصْدَقُ: زیادہ سچا ہے
مِنَ اللّٰهِ: اللہ سے
حَدِيْثًا: بلحاظ بات کے

نوٹ ۱: میدانِ اُحد سے مکہ واپس ہوتے ہوئے کفار اور مسلمانوں کے درمیان اگلے سال میدانِ بدر میں دوبارہ جنگ کرنے کا وعدہ ہوا تھا۔ وقت آنے پر اس کی تیاری میں کچھ مسلمانوں کو تامل تھا۔ اس وقت آیت ۸۴ نازل ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ میدانِ بدر میں پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار قریش کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور وہ مقابلہ پر نہیں آئے۔ اس طرح اللہ نے ان کی جنگ کو روک دیا۔ (معارف القرآن)

عمومیت کے پہلو سے آج کل ہمارے لیے اس آیت میں یہ راہنمائی ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں سے مذاکرات اگر ناکام ہو جائیں تو ان کی جنگ کو روکنے کے لیے ان سے جنگ کی جائے' کیونکہ لوہا لوہے سے کٹتا ہے پھول کی پتی سے نہیں۔

نوٹ ۲: کوئی ہمارا مدّمقابل (competitor) اپنا کوئی کام اگر سفارش کے ذریعے نکلوا لیتا ہے تو ہم سفارش کرنے والے اور اسے قبول کرنے والے کو برا کہتے ہیں اور اگر کبھی ہمارا کوئی کام کسی کی سفارش سے نکل جائے تو ہم ان دونوں کو ثواب کی خوشخبری دیتے ہیں۔ کسی سفارش کے اچھے یا برے ہونے کا یہ معیار غلط ہے۔ اس لیے

ضروری ہے کہ جائز اور ناجائز سفارش کا فرق ہمارے ذہن میں واضح ہو۔ آیت ۸۵ کی تفسیر میں معارف القرآن میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

کسی سفارش کے اچھا یا جائز ہونے کے لیے شرط ہے کہ:

(۱) جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو۔
(۲) آپ اس کا مطالبہ متعلقہ حاکم تک پہنچا دیں۔
(۳) اس کا کوئی معاوضہ نہ لیں۔
(۴) سفارش قبول کرنے کے لیے متعلقہ حاکم پر کوئی دباؤ نہ ڈالیں۔ اور
(۵) حاکم جو بھی فیصلہ کرے اس پر راضی رہیں۔

ان شرائط کو پورا کرتے ہوئے سفارش کرنے والے کو ثواب ملے گا خواہ اس کی سفارش قبول ہو یا نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ سفارش کیا کرو، تمہیں ثواب ملے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ بی بی عائشہؓ کی آزاد کردہ کنیز بریرہؓ نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر لی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ بریرہؓ نے پوچھا کہ یہ حکم ہے یا سفارش؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں سفارش ہے! انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی۔ رسول اللہ ﷺ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے۔ اسی طرح کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لیے اللہ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے کہ اللہ تیری بھی حاجت پوری فرمائے۔ (معارف القرآن)

اچھی اور بری سفارش کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی کوشش سے جب کچھ لوگوں کو کسی نیکی کے کام پر آمادہ کرتا ہے، تو جب تک وہ لوگ نیکی کرتے رہیں گے، اسے اس میں حصہ ملتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کچھ لوگوں کو برائی پر آمادہ کرتا ہے، تو جب تک وہ لوگ وہ برائی کرتے رہیں گے، وہ برائی اس کے حصے میں بھی آتی رہے گی۔ لیکن اس کی وجہ سے نیکی یا برائی کرنے والوں کے اپنے ثواب یا سزا میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

نوٹ ۳: نزولِ قرآن کے وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے اور اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انہیں آیت ۸۶ میں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ حق کی دعوت دینے والوں کے لیے ترش روی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین ہوتی ہے مگر اس کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

آج کل مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمان بھائی آپس میں تعلقات کشیدہ کر لیتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر غور کرنا چاہیے۔

* * *

خدمتِ قرآن کے میدان☆

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

قرآن کریم پر کلام اللہ اور کتاب اللہ کی حیثیت سے ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے اجزائے ایمان کا ایک جزء بھی ہے اور کامل و مکمل ایمان کے مضمرات اور مقتضیات کی تمام تفصیلات کی اساس اور بنیاد بھی ہے۔ قرآن بیک وقت منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین بھی ہے اور سالکِ راہِ خدا یا مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے راہ و رسمِ منزل سے آگاہی اور سخت مقامات کی نشان دہی پر مشتمل ایک مکمل مجموعۂ ہدایت بھی ہے۔ قرآن معاش و معاد یعنی دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی کے لیے راہنما ہے اور اس نصب العین کے حصول میں پیش آنے والی ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کی دواء اور شفاء ہے۔ گویا وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔

مگر اس وقت ہمارا موضوع قرآن کی اہمیت یا عظمت کا بیان نہیں ہے۔ یہ چند فقرے بھی تمہید کے طور پر زبان (قلم) پر آ گئے۔

دین اسلام میں قرآن کا یہ مقام ہی اس کے ماننے والوں پر کچھ فرائض اور واجبات عائد کرتا ہے۔ اسی کو آپ ''مسلمانوں پر قرآن کے حقوق'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان حقوق اور فرائض کو مختصراً ہم پانچ یا چھ بنیادی عنوانات میں تقسیم کر کے ''حقوق پنجگانہ'' یا شش جہات واجبات کی صورت میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر ان حقوق کی ادائیگی اور ان فرائض کی بجا آوری سے خدمت قرآن کے اتنے میدان سامنے آتے ہیں کہ ان تمام میدانوں میں قرآن کے لیے کام کرنا اور اس میں خدمت کا حق ادا کرنا کسی ایک فرد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اسی لیے یہ مجموعی طور پر پوری اُمت کی ذمہ داری ہے اور تقسیم کار کے طور پر اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق قرآن کریم کی کوئی نہ کوئی خدمت سرانجام دینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

نبی کریم ﷺ آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے تابعین اور بعد میں آنے والے سلف صالحین نے مختلف میدانوں میں قرآن کی جو خدمات سرانجام دیں اس نے آنے والوں کے لیے نہ صرف عمل کی راہیں متعیّن کر دیں بلکہ خدمت قرآن کے بہترین عملی نمونے بھی چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر لبیب السعید نے اپنی کتاب ''الجمع الصوتی الاول للقرآن الکریم'' میں اُمتِ مسلمہ کی قرآنی خدمات پر تبصرہ کا آغاز علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں سے چند سطروں کے ترجمہ سے کیا ہے:

''لیس فی الدنیا کتاب وضعت فی خدمته مثل هذه الکثرة من المواهب التی وضعت

☆ یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

فی خدمۃ القرآن و لا مثل ھذہ الوفرۃ من العمل و الوقت و المال"

علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم کی اصل عبارت یوں ہے:

"There is no book in the world in whose service so much talent so much labour, so much time and money have been expended as has been the case with the Quran."

قرآن سے متعلق فرائض ادا کرنے یا قرآن کے لیے خدمات سرانجام دینے کے کام کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) حفاظتِ قرآن (۲) نفاذِ قرآن

حفاظتِ قرآن میں اس کے متن کی حفاظت' اس کے معنی کی حفاظت اور اس کی حقانیت کی حفاظت شامل ہیں اور حفاظتِ قرآن کی غایت احکامِ قرآنی کا عملی نفاذ ہے۔ حفاظتِ قرآن سے متعلق تمام خدمات و انتظامات آیۂ کریمہ ﴿لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝۴۲﴾ (حٰمٓ السجدۃ) کی عملی تفسیر اور ظہورِ حق کا ایک نمونہ ہیں تو نفاذِ تشریعِ قرآنی کی ہر مخلصانہ کوشش بفحوائے آیت کریمہ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ﴾ (بنی اسراءیل: ۸۱) غلبۂ حق کی منزلِ مراد کی طرف ایک قدم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی زمانے میں یا کسی جگہ کے مسلمانوں نے خدمتِ قرآن کے کسی ایک میدان میں کوتاہی اور تساہل سے کام لیا تو اس کی تلافی کے لیے کسی دوسرے زمانے یا کسی دوسرے علاقے میں اللہ تعالیٰ افراد و جماعات کی صورت میں خدامِ قرآن پیدا کرتا رہا ہے۔

حضرات! یہاں تک پہنچنے کے بعد اور ''منزلِ مراد'' اور ''ادائے واجب میں کوتاہی'' کے ذکر سے مجھے پاکستان اور قرآن میں ایک عجیب مماثلت نظر آئی۔ مثلاً:

(۱) دونوں کی خدمت خلوص سے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ کی جا رہی ہے۔

(۲) دونوں کے واسطے کام کرنے والوں کے مقابلے پر دونوں سے اپنا کام لینے والے زیادہ ہیں۔

(۳) پاکستان کے مقاصد اور قرآن کے مطالب کا خلاصہ لا الٰہ الا اللہ ہی تھا اور ہے' لیکن دونوں کے نام لیواؤں میں اللہ اور غیر اللہ کے فرق کو بھی نہ سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

(۴) پاکستان اور قرآن کے مقاصد کے مطابق چلنے کی بجائے دونوں کو اپنے مقاصد کے مطابق ''چلانے'' والے بھی سرگرمِ عمل ہیں۔

(۵) اس وقت دونوں ہی اندرونی خرکاروں اور بیرونی تخریب کاروں کے نرغے میں ہیں۔ اور یوں دونوں کی خدمت میں ایک طرح کا عدمِ استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

یہ سوچ کر اور پھر یہ دیکھ کر کہ ان محاضرات کے عنوانات میں استحکام کا لفظ غالب ہے تو اب مجھے اپنے عنوان ''خدمتِ قرآن کے میدان'' کو ''استحکامِ خدماتِ قرآن'' میں بدل لینا مناسب معلوم ہوا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ خدمتِ قرآن کے میدان اب میں کیا متعین کروں گا' وہ تو عہدِ رسالت اور دورِ تبع تابعین کے درمیان ہی متعین ہو چکے تھے' بعد والے تو اس میں اپنی ''خدمت'' کے لیے ''ختم شریف'' کا اضافہ ہی کر سکے۔

لہٰذا اب ہم خدمتِ قرآن کے صرف ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے جہاں ہمارے بزرگوں نے تن دہی

سے کام کیا، مگر ہم نے اپنی غفلت سے عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس طرح خدمتِ قرآن کے بنیادی میدان بنتے ہیں: اسے لکھنا لکھانا، اسے پڑھنا پڑھانا، اسے سمجھنا سمجھانا، اس کو دشمنوں کے حملوں سے بچانا اور معاشرے میں اسی کے قانون کا سکّہ جمانا۔

قرآن کے لیے کوئی خدمت سرانجام دینے کا سب سے پہلا موقع یا اعزاز جو بعض صحابہؓ کو حاصل ہوا وہ کتابت وحی کا تھا۔ عہدِ رسالت میں کتابتِ آیات کی یہ خدمت ہی عہدِ صدیقی میں جمع قرآن بصورت مصحف ظاہر ہوئی اور اسی مصحف کی نقول سے عثمانی ایڈیشن کے مصاحف تیار کیے گئے۔ اس طرح مصاحفِ عثمانیہ کے ذریعے عہد نبویؐ کا طریق کتابت بھی محفوظ ہو گیا —— اور اسی لیے آئندہ کے لیے کتابتِ مصحف کا معیارِ صحت یہی قرار پایا کہ وہ ان مصاحف میں سے کسی ایک کی ہو بہو نقل ہو یا اس سے تیار کردہ نقل کی نقل ہو —— اور اس میں مصاحفِ عثمانی میں استعمال شدہ طریق املاء وہجاء سے سرِ مو بھی تفاوت نہ ہو۔ اس طریقِ املاء کا نام ہی رسمِ عثمانی پڑ گیا۔ اور جن کو بوجوہ یہ نام اچھا نہ لگا انہوں نے بھی رسم قرآنی یا رسمِ مصحف کے نام سے اسی طریق املاء وہجاء کی پیروی کو لازمی مانا۔

یہی وجہ ہے کہ کاتبانِ مصاحف کی راہنمائی کے لیے اور علمائے تجوید وقراءت کے استفادہ کے لیے اس مخصوص فن یعنی علم الرسم پر الگ کتابیں تالیف کی گئیں۔

مختلف عوامل کے باعث بعض اسلامی خصوصاً ایشیائی ممالک میں رسم عثمانی کے اس التزام سے تساہل برتا جانے لگا۔ تاہم اندلس اور افریقی ممالک اس خرابی سے محفوظ رہے۔

رسم عثمانی کی غلطیوں پر مبنی نسخوں سے کتابت کے باعث آہستہ آہستہ یہ غلط املاء آنکھوں کو مانوس نظر آنے لگا۔ مصاحف خطیہ کے دور تک تو قدرتاً ان اغلاط کی اشاعت کا دائرہ محدود رہا مگر دورِ طباعت میں یہ اغلاط آناً فاناً اضعافاً مضاعفہ ہونے لگیں تو اہل علم اس صورت حال سے بے چین ہو گئے اور گزشتہ صدی میں اس کوتاہی اور تساہل کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔ ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۸ھ میں رضوان بن محمد المخلاتی کے زیر اہتمام مصر سے ایک مصحف شائع ہوا جس میں بڑی حد تک رسم عثمانی کا التزام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ ہی سے حکومت مصر کے زیر اہتمام فواد الاول کے زمانے میں ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء میں اہل علم ماہرین فن کے ایک بورڈ کی نگرانی میں بڑے اہتمام سے وہ مشہور نسخہ شائع ہوا جو عموماً مصحف الملک یا نسخہ امیریہ کے نام سے معروف ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اور اس میں رسم عثمانی کی ان چار غلطیوں کو بھی درست کر دیا گیا جو طبع اول میں رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد سے شرقِ اوسط کے تمام عرب ممالک میں شائع ہونے والے مصاحف بالعموم اسی مصری مصحف طبع دوم سے نقل کیے جاتے رہے ہیں۔ اس مصری نسخے پر مبنی مگر بہت خوبصورت نسخہ دمشق سے الدار الشامیہ نے ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور ۱۹۸۵ء میں حکومت سعودی عرب نے یہی نسخہ مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ پاکستان میں مولوی ظفر اقبال صاحب مرحوم نے اسی مصری نسخہ پر مبنی تجویدی قرآن کا نسخہ تیار کروایا جسے پیکیجز لمیٹڈ نے ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والا یہ واحد مصحف ہے جس میں رسم عثمانی کا التزام کیا گیا ہے۔

جن نسخوں کا ابھی ذکر ہوا ہے یہ سب قراءت کے لحاظ سے حفص عن عاصم والی روایت پر مبنی ہیں۔ مصری نسخہ کا اہتمام دیکھ کر بعض دوسرے افریقی ملکوں میں جہاں حفص کے علاوہ دوسری روایاتِ قراءت متداول ہیں' انہوں نے بھی رسمِ عثمانی کے التزام پر مبنی مگر اپنے ہاں رائج قراءت کی علاماتِ ضبط کے ساتھ مصاحف شائع کیے ہیں۔ ورش عن نافع والی روایت تمام افریقی ملکوں خصوصاً نائیجیریا' مراکش وغیرہ میں عام ہے۔ حکومت سوڈان نے ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں دوری عن ابی عمرو البصری کی روایت پر مبنی نسخہ قرآن شائع کیا اور تونس سے ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں قالون عن نافع کی روایت پر مبنی نسخہ عبدالعزیز خماسی کی کتابت سے شائع ہوا اور ابھی حال میں حکومت لیبیا نے بھی قالون عن نافع کی روایت پر مبنی ابوبکر ساسی کی کتابت کے ساتھ ایک نسخہ قرآن شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ بھی رسمِ عثمانی پر ہی مبنی ہے۔ ان مصاحف کی اشاعت سے ایک دفعہ پھر کتابتِ مصاحف میں رسمِ عثمانی کے التزام کا احساس یا تجدیدِ احساس ایک تحریک کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

رسمِ عثمانی کے عام رسمِ املائی سے اختلاف اور کتابتِ مصحف میں خود رسمِ عثمانی میں بھی کئی جگہ کسی اصول کی پابندی کے فقدان کے اسباب کی تلاش میں —— رسمِ قرآنی کے توقیفی ہونے سے لے کر صحابہؓ کے قواعد املاء سے ناواقفیت جیسے انتہائی متضاد نظریات وجود میں آئے —— تاہم گزشتہ صدی میں شمالی عرب اور شام کے بعض علاقوں سے قبل از اسلام دور کے بعض قبطی کتبات کی دریافت نے رسمِ عثمانی کے مآخذ و مصادر کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔

رسمِ قرآن کے اس فنی پہلو کے ساتھ ساتھ خطِ قرآن نے حسن و جمال کے کئی قالب گزشتہ چودہ صدیوں میں اختیار کیے اور جمالِ خط کے ساتھ بعض دفعہ کتابتِ مصاحف میں صنائع و بدائع کا استعمال تو بعض دفعہ اعجازِ قرآنی کا ایک مظہر نظر آتا ہے۔ کتابتِ مصاحف یا خطِ قرآن جہاں خدمتِ قرآن کا ایک میدان ہے وہاں اس خدمت میں محبت و عقیدت کا ایک مظہر بھی ہے۔

افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں طباعت و اشاعتِ قرآن کے نام سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کا کاروبار کرنے والے ادارے ابھی تک رسمِ عثمانی کے مفہوم و معنی سے ناواقف ہیں اور ہماری حکومت جو آئینی اور قانونی طور پر قرآن کریم کی درست کتابت و طباعت کی ذمہ دار ہے وہ ابھی اس طرف کوئی عملی توجہ نہیں دے رہی —— حکومت ناشروں کے نام ایک سرکلر جاری کر دیتی ہے کہ نسخہ ہائے قرآن رسمِ عثمانی کے مطابق شائع کیے جائیں' لیکن خود حکومت اس معاملے میں کوئی راہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔

قرآن کریم کی کتابت ہی کے سلسلے میں ہجاء و رسم کے علاوہ بعض اور امور مثلاً ضبط' وقف' شمار آیات' مواقع سجدات وغیرہ کی نشاندہی اور مختلف تقسیماتِ مصحف بھی شامل ہیں۔ تاہم ان امور کا تعلق چونکہ قرآن کریم کی قراءت سے ہے اس لیے ان کا ذکر ہم ابھی آگے تعلیم و تعلّمِ قرآن کے ضمن میں کریں گے۔

کتابت کے بعد قرآن کی دوسری اہم بنیادی خدمت اس کا پڑھنا پڑھانا ہے۔ کتابتِ وحی کے برعکس قراءت اور تلاوتِ قرآن کی ابتدا خود آنحضرت ﷺ سے ہوئی۔ کتابت تو آپؐ کسی سے کروا لیتے تھے مگر قرآن کی قراءت آپ خود جبریلؑ سے سن کر حفظ کر لینے کے بعد خود صحابہ کو پڑھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ آپؐ سے پڑھے ہوئے خود آگے پڑھانے پر مامور کیے گئے۔ ابتدائی مکی دور سے ہی حضور ﷺ کی لکھوائی ہوئی سورتوں اور آیات

کی نقول بھی صحابہؓ میں پھیلنے لگیں اور قرآن حفظ بھی کیا جانے لگا۔ قرآن کریم کی قراءت کی تعلیم محض تحریر کی بجائے تلقی اور سماع کے ذریعے جاری رہی۔

مدنی دور کے آخری حصے میں قرآن کریم کی تعلیم اور تدریسِ قراءت علاقائی حکّامِ بالا کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ ہمارے لیے یہاں عہدِ نبویؐ میں قرآن پڑھنے پڑھانے کے اس نظام کی پوری تفصیلات میں جانا ممکن نہیں، البتہ یہاں قراءت قرآن کے سلسلے میں دو باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ آپؐ نے اپنے عملی اقدامات کے علاوہ تعلیم و تعلّمِ قرآن، اس کی قراءت اور اس کے حفظ کے فضائل پر اتنا زور دیا کہ اس سے مسلمانوں کے اندر تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لیے ایک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

(۲) قراءتِ قرآن کے سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے خود بھی قرآن کریم میں بعض کلمات کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا اور پڑھایا اور عرب کے مختلف قبائل کو ان کے اپنے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی۔

عربوں کے اس لہجاتی فرق کو سمجھنے کے لیے کتابوں میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضور ﷺ خود بھی ان قبائل کے ساتھ بعض دفعہ ان ہی کے لہجے میں گفتگو فرما لیتے تھے۔ صرف دو مثالوں سے اندازہ کر لیجیے:

(۱) ایک آدمی نے آنحضور ﷺ سے پوچھا:

امم برم صیامم بم سفر (یعنی **امن البر الصیام فی السفر**)

آپؐ نے جواباً فرمایا: **لیس مم برم صیامم بم سفر** (یعنی **لیس من البر الصیام فی السفر**)

(۲) بنی سلیم کے ایک آدمی نے پوچھا:

یا رسول اللّٰہ ایدالك الرجل اھلہ؟ (یہاں **یدالك** بمعنی **یماطل** آیا ہے)

آپؐ نے فرمایا: **اذا کان مفلجا** (یعنی **مفلسا**)

حضرت ابوبکر ؓ کے دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی تھی۔

قبائل عرب کے بعض لہجاتی خصوصیات کا ذکر کتابوں میں مختلف ناموں سے ملتا ہے۔ اس قسم کی چیزیں لغت قریش میں عیب شمار ہوتی تھیں اور قرآن لغت قریش میں ہی نازل ہوا تھا۔ بہر حال قبائل عرب کو اپنے لہجے کے ساتھ قراءتِ قرآن کی اسی اجازت سے ہی قراءت کا وہ اختلاف نمودار ہوا جس کے اندر افتراقِ اُمت کے ایک اِمکانی خطرہ کے سد باب کے لیے عہد عثمانی میں یہ اجازت واپس لے لی گئی اور مصحف صدیقی پر مبنی وہ عثمانی ایڈیشن تیار ہوا جو آج تک پوری اُمت کے لیے کتابت و قراءتِ قرآن کی صحت کا معیار چلا آتا ہے اور جس میں کسی لفظ بلکہ دندانہ (نبرہ) کے بدلے بغیر آنحضرت ﷺ سے بطریق تواتر ثابت تمام اختلاف ہائے قراءت کی گنجائش موجود ہے۔

ابتدائی اُموی دور میں غیر عربوں کو قراءتِ قرآن میں صحت و سرعت پر قادر کرنے کے لیے حرکات اور اعجام کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ ایک مستقل علم بن گیا جسے علم الضبط کہا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اور تمام مستند اختلاف ہائے قراءت کو ملحوظ رکھنے کی بنا پر علم الضبط یا علاماتِ ضبط کے اصول و قواعد مرتب ہوئے۔ قراءتِ قرآن سے مربوط علم الاصوات یا صوتیاتِ قرآن (phonetics) کے تقاضوں کو

علاماتِ ضبط کے ذریعے واضح کرنے کی کوششیں جاری رہیں اور اب تک جاری ہیں۔ پرانے زمانے میں قلمی مصاحف میں بعض علاماتِ ضبط سرخ سیاہی سے ڈالی جاتی تھیں۔ دورِ طباعت میں جب یہ ممکن نہ رہا (اب ممکن ہے اگرچہ مہنگا ہے) تو علاماتِ ضبط میں تجدید و ایجاد کا عمل ایک دفعہ پھر شروع ہوا۔ اس کے مظاہر مصر کے مصحف الملک کے علاوہ مصحف حلبی ۱۹۳۵ء/۱۳۵۴ھ نیز تونسی، لیبی، سوڈانی، سعودی مصحف اور پاکستان کے تجویدی قرآن مجید میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں قراء سبعہ کی بعض خاص خاص روایات متداول ہوگئی ہیں۔ مثلاً مصر اور ایشیائی ممالک میں روایت حفص عن عاصم۔ مراکش، غانا اور نائیجریا میں ورش عن نافع، تونس و لیبیا میں قالون عن نافع، سوڈان میں الدوری عن ابی عمر و البصری رائج ہیں۔

اختلافِ قراءت کے علاوہ بعض دفعہ ایک ہی روایت اور قراءت کے لیے مختلف ملکوں میں مختلف علاماتِ ضبط استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ترکی، ایران، برصغیر اور چین میں روایت حفص رائج ہونے کے باوجود ہر ملک کی علامات ضبط جدا ہیں۔ نائیجیریا اور مراکش میں روایت ورش کے باوجود اندازِ کتابت اور طریق ضبط دونوں جدا ہیں۔

دراصل ہر جگہ خادمانِ قرآن نے قرآن میں نبی ﷺ سے ثابت نطق صحیح کو مختلف علاماتِ ضبط کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی جدید ترین اور مفید مثال تجویدی قرآن ہے۔

تمام علاماتِ ضبط کے اس سارے نظام اور ان تمام مساعی کے باوجود قرآن کی درست قراءت اور صحیح نطق کا دار و مدار بالمشافہ تعلیم پر ہے۔ آپ کسی طریقہ علاماتِ ضبط کو دیکھئے، عموماً ہر مشکل تلفظ مثلاً ادغام ناقص، اخفاء، اظہار، قلقلہ، امالہ، اشمام، اختلاس، تسہیل ہمزہ یا بین بین اور اختلاس کی علامات لکھ کر بھی ساتھ ہی لکھا جاتا ہے کہ: **یدرك بالمشافهة یا یؤخذ بالتلقی والمشافهة** اور کبھی صاف لکھا ہوتا ہے: **ولا یحكم ذلك كله** او **ربالمشافهة والسماع من لفظ الشیوخ**۔

دورِ حاضر کی ایجادات کو خدمتِ قرآن کے لیے استعمال کرتے ہوئے قرآن کے خادموں نے ریکارڈنگ کے ذریعے قراءات میں اس نطق صحیح کو بھی محفوظ کر لیا ہے جو بسند تواتر عہد نبوی سے علم القراءات کے اساتذۂ فن کے ذریعے بذریعہ تلقی و سماع محفوظ چلا آتا تھا۔

اس وقت تک حفص، ورش اور دوری کی روایاتِ قراءت میں مکمل قرآن ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تدریسی اور تعلیمی مقاصد کے لیے سبعہ قراءت پر مشتمل ریکارڈنگ جاری ہے۔

قرآن کی درست قراءت کی تعلیم کے سلسلے میں خدام قرآن کے نوٹس میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی درست قراءت کے ساتھ قرآن پڑھانا فرض ہے۔ کم از کم بقدر نماز درست قرآن یاد کرنا اور اسے درست پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کہتے ہیں کہ مشہور تابعی ابو عبد الرحمٰن السلمی باوجود اپنی تمام تر علمی بزرگی اور بلندی مرتبہ کے، پورے چالیس سال تک جامع کوفہ میں صرف قرآن پڑھانے میں مصروف رہے اور یہ صرف حدیث ((**خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ**)) سے متاثر ہو کر۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں یہ فرض بھی ٹھیک طور پر سرانجام نہیں دیا جا

رہا۔ بچوں کے لیے بازار میں دستیاب قرآنی قاعدے تک اغلاط سے مبرّا نہیں ہیں سوائے ایک آدھ کے۔

ضروری ہے کہ بچوں کے لیے مدارس میں نطق صحیح اور قراءت صحیح کی مشق رکھنے والے قراء معقول مشاہروں پر رکھے جائیں اور تلقی وسماع کے مسنون طریقے کا احیاء کیا جائے۔

بچوں کو صحتِ تلفظ اور نطقِ صحیح کے ساتھ قرآن حفظ کرانے کا بندوبست کرنا خدمت قرآن کا نہایت اہم میدان ہے۔ بدقسمتی سے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اساتذۂ قرآن تلامذہ پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

اسی طرح حفظ قرآن کی حوصلہ افزائی کے علاوہ اس کی صحیح لائنوں پر تکمیل وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ قراءتِ قرآن سے ناآشنا نظر آتے ہیں، حالانکہ اسلامی نظام تعلیم کی بدولت تو ہر قرآن خوان اپنی علاقائی زبان پڑھنے (ریڈنگ) پر قادر ہو جاتا تھا۔

لکھنے اور پڑھنے کے بعد یا کتابت وقراءت کے علاوہ قرآن کی خدمت کا اگلا میدان قرآن سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اس میدان میں اگلوں کی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے تراجم وتفاسیر قرآن کے ضخیم ذخائر کے علاوہ معاجم قرآن (ڈکشنری) اور قرآنی موضوعات پر مستقل تالیفات کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے۔

تاہم اتنے ذخیرہ کے فراہم ہو جانے کے باوجود کسی چیز کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا اور کسی بھی تفسیر یا ترجمہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور ترجمہ یا تفسیر کی ضرورت نہیں۔

اس وقت ایک قابل غور امر جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، یہ ہے کہ آج کی زندگی میں ماہرین کے پاس بھی ضخیم کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے۔ زندگی کے اس رواں دواں دور میں چھوٹے پمفلٹ یا مضامین وغیرہ کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کا کام کیا جائے اور درست قرآنی فہم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کریم کے سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں ہی خدمت قرآن کا ایک عظیم میدان عربی زبان کی تدریس و اشاعت ہے۔ قرآن کی برکت سے اور اس کی وجہ سے عہد نبوی کی عربی زبان ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔ قرآن کی زبان کی خدمت کے لیے مسلمانوں میں علم صرف ونحو کی ابتدا اور ارتقاء کے منازل طے ہوئے۔ اس مقصد کے لیے ہی عربی معاجم کی تالیف، شعر جاہلیت کی تدوین وغیرہ کا سارا کام ہوا۔

مسلمانوں کے لیے عربی کی علمی وادبی اور ملی وسیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے غالباً آغا خان کی طرف سے یہ تجویز آئی تھی کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی بنائی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان سے صوبائی اسمبلی کے ۶۵ ارکان نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک قرارداد مرکزی حکومت کو بھیجی تھی جس میں عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ پھر ۱۹۵۵ء میں کراچی کے متعدد رہنماؤں نے ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے مرحوم حسین شہید سہروردی سے عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنا لینے کی اپیل کی تھی۔ اگر اس وقت عربی کو ملی اور دینی زبان کی حیثیت سے دوسری پدری اور مادری زبانوں پر ترجیح دی جاتی اور عربی کو سرکاری زبان بنا لینے کے کسی ۲۰، ۲۵ سالہ منصوبے کی بنیاد رکھ دی جاتی تو شاید آج پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔

بہرحال عربی زبان کی تدریس وتعلیم کے مراحل اور درجات (levels) اور مقاصد وغایات متعدد ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کو براہِ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان کی تعلیم کو پڑھے لکھے طبقے میں اتنی حد تک زیادہ سے زیادہ

عام کرنا چاہیے کہ ایک پڑھا لکھا مسلمان مختلف تراجم قرآن کے تقابلی حسن وخوبی کو جانچ سکے، ورنہ کم از کم یَعْبُدُوْنَ اور یَدْعُوْنَ کا ایک ہی ترجمہ کرنے والوں کی غلطی یا گمراہی کو تو سمجھ سکے۔

عربی دوبئ کے لیے بھی سیکھی جا سکتی ہے اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی، دونوں مقصد اپنی جگہ مفید ہیں، مگر دوبئ والی عربی سے قرآن نہیں سمجھا جا سکے گا اور پی ایچ ڈی والی عربی پورے قرآن کا ترجمہ بالاستیعاب پڑھنے کی فرصت ہی نہیں پیدا ہونے دے گی۔ قرآن فہمی کے لیے عربی سیکھنا نسبتاً آسان بھی ہے۔ قرآن کریم کی پوری حرکات اور علاماتِ ضبط کے ساتھ کتابت عربی سیکھنے میں مدد بھی دیتی ہے۔ قرآن فہمی کے لیے صرف اور نحو کی حد تک عربی زبان کی مضبوط بنیاد پر تحصیل کے بعد پورے قرآن کے ترجمہ سے اس طرح گزرنا کہ صرف ونحو کی حد تک ہر بات سمجھ لی جائے، یہ ایک نیا تجربہ ہے جو انجمن خدام القرآن نے شروع کیا ہے، اور قرآن کی خدمت کا ایک نیا میدان ہے۔ پچیس سال تک کالج اور یونیورسٹی میں عربی واسلامیات کی تدریس میں بسر کرنے اور ڈگری کی حد تک استعداد واہلیت رکھنے کے باوجود بالاستیعاب **الحمد** سے **والناس** تک قرآن کے ایک ایک لفظ کو سمجھتے ہوئے گزرنے کا اس سے پہلے خود مجھے بھی موقع ہی نہیں ملا بلکہ فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔ اس کورس میں اگر کسی طرح جلالین یا کوئی مختصر عربی تفسیری حاشیہ بھی پڑھا دیا جائے تو آئندہ عربی عبارت پڑھنے کی بھی راہ ہموار ہو جائے گی اور حسب ضرورت عربی تفاسیر سے استفادہ بھی ممکن ہو جائے گا۔

موجودہ زمانے کے لحاظ سے قرآن کی خدمت کا ایک نہایت اہم اور ضروری میدان، قرآن کی حقانیت کی حفاظت یا اس پر دشمنوں کے اعتراضات کا باطل شکن جواب دینا بھی ہے۔ یوں تو خود قرآن نے اہل مکہ کے قرآن پر اعتراضات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ صرف الفاظ وعبارات کا جامہ بدل جائے تو اور بات ہے ورنہ اپنی اصل اور روح کے لحاظ سے آج کے دشمنوں کے تمام اعتراضات کے جواب کی اصل خود قرآن سے مل سکتی ہے۔ عبدالجبار معتزلی (م ۴۱۵ھ) کی تنزیہ القرآن عن المطاعن سے لے کر عبدالفتاح قاضی اور ڈاکٹر عبدالفتاح اسماعیل شلبی اور عبدالعظیم زرقانی وغیرہ کا مستشرقین کے مغالطوں کے پردے چاک کرنا، یہ سب اسی میدان میں خدمت قرآن کے نمونے ہیں۔ تاہم اس میدان میں اردو زبان میں ابھی بہت کم کام ہوا ہے اور مزید توجہ طلب ہے۔

خدمتِ قرآن کے ان میدانوں میں مستحکم بنیادوں پر قرآن کے لیے خدمات سرانجام دینے کے لیے ہر کوشش مسلمان کے لیے ایک بڑی سعادت ہے۔

تشریعِ قرآنی کے نفاذ سے بظاہر قرآن کے لیے مختلف خدمات سرانجام دینے میں بھی مزید استحکام کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن چاہے جو میدان ہو یا جو مرحلہ، قرآن کی خدمت کرتے ہوئے یا خدمت کی توفیق پاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس سے خلوصِ نیت حاصل ہونے کی دعا کرنی چاہیے۔ یوں تو نیکی کے کسی میدان میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے تاہم قرآن کے لیے اور قرآن کے نام سے کوئی کام کرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی مرحلے پر شیطان سے واسطہ پڑنے کے امکانات زیادہ ہیں، چاہے وہ اپنا نفس ہو یا کوئی خارجی قوت۔

اور شاید اسی لیے قرآن پڑھنے سے پہلے ہی شیطان سے اس متوقع تصادم سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم ہے۔

* * *

اصول تفسیر القرآن بالقرآن: ایک مطالعہ

نذیر احمد علائی☆

یہ اصول تفسیر، تفسیر کی سب سے اعلیٰ و ارفع قسم ہے، کیونکہ یہ اصول ہم معنی قرآنی الفاظ یا ہم معنی قرآنی آیات میں مضمر ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح میں قرآن حکیم کی دیگر آیات سے، جن میں وہ معنی زیادہ وضاحت سے آیا ہو، فائدہ حاصل کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد ابوشہبہ اس اصطلاح کی تعریف یوں کرتے ہے:

> هو تفسير بعض آيات القرآن بما ورد في القرآن نفسه فان القرآن يفسّر بعضه بعضا(۱)
>
> ''تفسیر القرآن بالقرآن سے مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم کی کسی آیت کی تفسیر، قرآن ہی کی کسی دوسری آیت سے کی جائے، کیونکہ قرآن کے ایک حصے کی تفسیر دوسرے حصے سے ہو جاتی ہے۔''

اس طرح پورے قرآن میں یہ اسلوب، تفسیر القرآن بالقرآن ملتا ہے۔

ہم معنی الفاظ کے درمیان فرق: قرآن میں کوئی لفظ ضرورت سے زیادہ نہیں وارد ہوا ہے اور نہ کوئی ایسا لفظ رہ گیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ عرب کہا کرتے ہیں: جب متعدد اشیاء میں یکسانیت بتانا ہو تو وہ کہتے کہ یہ ایک ڈھلا ڈھلایا کنگن ہے، جس کو دیکھ کر یہ نہیں پتا لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی انتہا کہاں ہے اور ابتدا کہاں سے ہوئی؟ قرآن کریم میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان کی نوعیت بھی بجنسہٖ اسی طرح کی ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کے دو اصول

(۱) تفسیر بالقرآن متّصلاً: بسا اوقات مجمل کی تفسیر نفس سورۃ میں اس کے ساتھ متّصل ہوتی ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ① وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ②﴾ (الطارق) تو نفس سورہ ہی میں متصلاً ''الطَّارِق'' کی تفسیر ''النَّجْمُ الثَّاقِب'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دی(۲)۔ نیز ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ (البقرة:۱۸۷) آیت میں جب ''مِنَ الْفَجْرِ'' کا اضافہ کیا گیا، تو کلام کا مطلب واضح ہو گیا۔(۳)

(۲) تفسیر بالقرآن منفصلاً: کسی وقت مجمل آیت کی تفسیر نفس سورہ میں یا کسی دوسری سورہ میں ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ㉒ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ㉓﴾ (القیامة)(٤) اس آیت میں رویتِ باری

☆ شعبہ دینیات، سنی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تعالیٰ کا جواز ثابت ہوتا ہے، جس کی مزید تشریح اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام:١٠٣) ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں''۔ اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل رؤیت ممکن ہے، البتہ اس کا حصر اور احاطہ جس کو ادراک کہتے ہیں، ناممکن ہے۔ (٥)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١﴾ (الفاتحۃ) اس آیت میں آپ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ تمام شکر و ثنا اللہ ہی کے لیے جو تمام جہانوں کا مربّی ہے۔ گویا کسی نے ربّ کے بارے میں پوچھا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی مزید تشریح فرمادی: ﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٣ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٢٤﴾ (الشعراء)

تفسیر القرآن بالقرآن کی اقسام

(١) تفسیر العام بالخاص: تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ عام کو خاص پر محمول کیا جائے۔ لفظ عام کے بارے میں عبدالوہاب خلاّف رقمطراز ہیں:

> ''عام' قرآن کریم میں وارد شدہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو اپنے اصلی لغوی مفہوم کے اعتبار سے بلا حصر و عدد اپنے تمام افراد کو شامل ہو۔''(٦)

اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ﴾ (البقرۃ:٢٥٤) ''اس سے قبل کہ وہ دن آئے، جس روز نہ سودے بازی ہوگی' نہ دوستی ہوگی اور نہ سفارش''۔ اس آیت کریمہ میں دوستی اور سفارش کی نفی بطریق عموم فرمائی' پھر دوسری آیت میں متقیوں کو دوستی کی نفی سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝٦٧﴾ (الزخرف) ''اُس روز دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے' سوائے متقیوں کے''۔ اسی طرح اللہ کی اجازت پر مبنی سفارش کو بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا' جیسا کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ﴾ (النجم:٢٦) ''آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دیتی' مگر اذنِ خداوندی کے بعد۔''

(٢) تفسیر المُجمل بالمُبیّن: تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ مجمل کو مبین پر محمول کر کے اس کے ساتھ مجمل کی تفسیر کی جائے۔ اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ﴾ (المؤمن:٢٨) ''اور اگر یہ رسول سچا ہے' تو جس عذاب کا وعدہ وہ تم سے کرتا ہے' اس میں سے کچھ تمہیں ضرور پہنچے گا''۔ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ﴾ (المؤمن:٧٧) ''جس بات کا وعدہ ہم ان سے کرتے ہیں' اگر اس میں سے کچھ آپؐ کو دکھا دیں''۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیت ٢٨ میں جس وعدہ کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے دُنیوی عذاب مراد ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝٢٧﴾ (النساء) ''جو لوگ شہوات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل ہی جھک جاؤ۔'' مذکورہ آیت کی وضاحت مابعد بیان کردہ آیت میں ہے کہ یہاں وضاحت کے ساتھ اہل کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾﴾ (النساء) ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا' وہ خود بھی گمراہی اختیار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔''(۷)

(۳) تفسیر المُطلق بالمقیّد: تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ اس سلسلہ میں امام غزالیؒ نے اکثر شافعیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب دو حکم الگ الگ ہوں اور ان کا سبب ایک ہو' تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ امام غزالیؒ نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ﴾ (المائدۃ:٦) ''اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو''۔ اس آیت میں ہاتھ دھونے کی حد کہنی تک مقرر کی ہے۔ پھر آگے اسی آیت میں تیمّم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ﴾ (المائدہ:٦) ''پھر اپنے چہروں اور ہاتھوں کو اس سے مل لو''۔ اس آیت کریمہ میں ہاتھ کی تحدید و تعیین نہیں کی گئی' لیکن اس آیت میں بھی ہاتھ کہنیوں تک مراد ہوں گے۔ (۸)

تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک طریقہ خاص القرآن ہے' اس کی درج ذیل اقسام ہیں: (۱) مطلق (۲) مقید (۳) امر (۴) نہی۔ خاص مقید کی مثال آیت کریمہ: ﴿اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾ (الانعام:١٤٥) میں ''مَسْفُوْحًا'' کا لفظ ہے' اس لیے کہ آیت کریمہ میں ''دَمًا'' (خون) کا لفظ مطلق وارد ہوا تھا' ''مَسْفُوْحًا'' نے اس کو مقید کر دیا' گویا یہاں خاص مطلق کو خاص مقید پر محمول کیا گیا ہے۔ (۹)

(٤) تفسیر الاجمال بالتّفصیل: تفسیر القرآن بالقرآن کی ایک قسم یہ ہے کہ جو چیز قرآن میں ایک جگہ مختصر آئی ہے' اس کی تفسیر ان آیات کے ساتھ کی جائے جہاں وہی مضمون تفصیلاً وارد ہوا ہے' مثلاً آدم و ابلیس کا واقعہ بعض جگہ مختصراً آیا ہے اور دوسری جگہ مفصلاً' یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کا ہے۔ (۱۰)

(٥) تفسیر القرآن بالاستقرار: تفسیر القرآن بالقرآن کی ایک قسم یہ ہے کہ جو چیز بظاہر مختلف نظر آتی ہے اس کو یکجا کر دیا جائے' مثلاً تخلیق آدم کے بارے میں بعض آیات میں ذکر کیا کہ ان کو ''تراب'' (مٹی) سے پیدا کیا' بعض میں ''طین'' (کیچڑ) کا ذکر کیا ہے' اور بعض میں ''صَلصَال'' (کھنکھناتی مٹی) کا ذکر کیا۔ ان بظاہر مختلف آیات میں جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان میں تخلیق آدم کے مختلف مراحل وادوار کا ذکر کیا گیا ہے جن میں وہ آغاز سے لے کر نفخ روح تک گزرے۔ (۱۱)

(٦) تفسیر القرآن بالقراء ات: قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے ان آیات سے بھی کی جا سکتی ہے جن میں بعض قراءتوں کو دوسری قراءتوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ بعض قراءتیں اگرچہ دوسری آیات سے الفاظ کے اعتبار سے مختلف ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے یکساں ہیں' مثلاً حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ''اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِنْ ذَهَبٍ'' ہے' جو مشہور قراءت ﴿اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ (الاسراء:٩٣) کی تشریح ہے۔ (۱۲)

بعض قراءتیں لفظ اور معنی دونوں میں مختلف ہوتی ہیں' لیکن ایک قراءت دوسری قراءت کی مراد کو متعین کرتی ہے' مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (الجمعة:٩) اس کی تفسیر دوسری قراءت ''فامضوا الی ذکر اللّٰہ'' کرتی ہے۔ (۱۳)

بعض قراءتوں میں کمی بیشی کی وجہ سے اختلاف ہوجاتا ہے اور دونوں قراءتوں میں جو بیشی ہوتی ہے۔ وہ کمی والی قراءت کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے' اس کی مثال وہ قراءت ہے جو حضرت ابن عباس ؓ سے منسوب ہے: ﴿لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۹۸) ''(اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم اپنے ربّ کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔'' یہ قراءت قرآن کریم کی موجودہ قراءت کی تفسیر ہے جس میں لفظ ''فی مواسم الحج'' ذکر نہیں ہے۔ اس آیت میں زائد فقرہ ''فی مواسم الحج'' نے قدیم عربوں کے جاہلانہ تصور کو ختم کر دیا ہے' کیوں کہ وہ سفرِ حج کے دوران کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو برا سمجھتے تھے' اس لیے کہ ان کے نزدیک کسبِ معاش ایک دنیادارانہ کام تھا' اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب اللہ کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے معاش کے لیے جدّوجہد کرتا ہے' تو دراصل وہ اپنے ربّ کا فضل تلاش کرتا ہے اور یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ (۱۴)

اس قسم کی قراءتوں کے بارے میں علماء کے خیالات مختلف ہیں' بعض متاخرین کا کہنا ہے کہ وہ قرآن کی دوسری صورتیں ہیں' جب کہ بعض دوسروں کا خیال ہے کہ وہ قرآن کا جزء نہیں ہیں' بلکہ تفسیر کے قبیل سے ہیں' اور یہی بات صحیح لگتی ہے' کیوں کہ صحابہ کرام ؓ قرآن کریم کی تفسیر کرتے تھے اور قرآنی آیات کے پہلو بہ پہلو تفسیر لکھنے کے بھی قائل تھے' چنانچہ امتدادِ زمانہ کے سبب بعض لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ قرآن کی مختلف صورتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوئی ہیں' اور آپؐ سے صحابہ کرام ؓ نے براہِ راست روایت کیا ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مختلف قراءتیں تفسیر القرآن بالقرآن کے لیے اہم مرجع ہیں۔ اس کی تصدیق حضرت مجاہد ؒ کی ایک روایت سے ہوجاتی ہے جس میں آپؒ نے فرمایا: ''اگر میں نے حضرت ابن عباس ؓ سے بہت سے سوالات کرنے سے پہلے حضرت ابن مسعود ؓ کی قراءت پڑھ لی ہوتی' تو مجھے ان سے اکثر سوالات پوچھنے کی حاجت نہ پڑتی۔''(۱۵)

قراءت کی تفسیری حیثیت کو مشہور یہودی مستشرق گولڈ زیہر نے بھی تسلیم کیا ہے' اس کا کہنا ہے:

> ''تفسیر القرآن کا اوّلین مرحلہ اور اس کا نقطہ آغاز خود قرآن ہی میں موجود ہے' بالفاظ دیگر ہم قرآن کی مختلف قراءتوں میں اس کی تفسیری کوششوں کا پہلا دور ملاحظہ کر سکتے ہیں۔''(۱۶)

ڈاکٹر غلام احمد حریری مذکورہ عبارت کی مزید توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآن کریم کی بعض متواتر قراءتوں کو بھی مرکزِ تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے' اگرچہ غیر متواتر قراءتوں کو قرآن ہونے کی حیثیت حاصل نہیں' تاہم ان کو نصوصِ قرآنی کی تفسیر تسلیم کر سکتے ہیں۔''(۱۷)

(۷) تفسیر الآیات للأحکام: قرآن کریم کی تفسیر قرآن کے ذریعہ سے ان احکامی آیات سے بھی کی جاسکتی ہے جن میں پہلے پہل کسی چیز کی خرابیوں اور خوبیوں کو واضح کیا گیا' پھر دوسری آیات میں اس کو حرام کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر شراب کی حرمت کے بارے میں آیاتِ الٰہی کو دیکھئے:

﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ

نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ (البقرہ: ۲۱۹)

''(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں؟ کہیے: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے' اگرچہ ان دونوں میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں' مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔''

یہ شراب کے متعلق پہلا حکم ہے' جس میں صرف اظہار ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس حکم کے آنے کے بعد بعض مسلمانوں نے شراب کو چھوڑ دیا تھا' لیکن بہت سے لوگ بدستور اسے استعمال کرتے رہے تھے' حتیٰ کہ بعض اوقات نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا حکم آ گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء: ۴۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ' (نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے) جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔''

اس آیت میں نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے' اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ ہو جائے' لیکن کچھ مدت کے بعد قطعی حرمت کا حکم آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۹۰﴾ (المائدۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا' اور یہ آستان اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔''(۱۸)

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ))(۱۹)

''اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر' اس کے پینے والے پر' پلانے والے پر' فروخت کرنے والے پر' خریدنے والے پر' کشید کرنے والے پر' ڈھو کر لے جانے والے پر' اور اس شخص پر جس کے لیے ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔''

قرآن کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی تمثیل ان آیات میں بھی ہو سکتی ہے جو زنا کی حرمت اور اس کی سزا کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ اسلام نے متعدد آیات و احادیث کے ذریعہ نکاح کی ترغیب دی ہے اور اس کے لیے راستے ہموار کیے ہیں' کیونکہ جنسی خواہشات کی تکمیل کا محفوظ ترین طریقہ یہی ہے اور یہی وہ مثالی طریقہ ہے جس سے ایک ایسی نسل وجود میں آ سکتی ہے جس کی تربیت' دیکھ بھال اور نگرانی میں ماں باپ دونوں شریک ہوں۔ اسی مقصد سے اسلام نے دلوں میں محبت و مودت' رحم اور عزتِ نفس کے جذبات پیدا کیے تاکہ یہ نسل اس کائنات کی

تعمیر میں اپنی مطلوبہ ذمہ داریاں پوری کر سکے' اور مفوضہ کردار سرانجام دے سکے۔ چنانچہ قرآن نکاح کی ترغیب دلاتے ہوئے کبھی کہتا ہے کہ یہ انبیاء اور مرسلین کی سنت اور ان کا طریقہ ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ﴾ (الرعد:۳۸) ''آپ سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا''۔ پھر قرآن کریم اللہ کے احسانات گناتے ہوئے کہتا ہے:

> ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ﴾ (النحل:۷۲)
>
> ''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں' اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے' اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔''

قرآن اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کا بھی تذکرہ کرتا ہے کہ وہ نکاح کو مالی آسودگی اور فارغ البالی کا ذریعہ بنا دے گا' نکاح کرنے والے کے مسائل کو حل کر دے گا' اور اسے ایسی قوت عطا کرے گا جس سے وہ فقر و فاقہ کے اسباب پر غلبہ حاصل کرنے پر قادر ہو جائے گا' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾﴾ (النور)
>
> ''اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

> ''جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں' بلکہ مندوب قرار دیتا ہے' یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بن بیاہے نہ بیٹھے رہیں۔'' (۲۰)

ماقبل بیان کردہ آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے نکاح کو فطری جنسی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے' اس لیے نکاح کے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور ہونا چاہیے تاکہ زندگی کی گاڑی اپنی طبعی رفتار سے چلتی رہے' لیکن دوسری جانب وہ غیر شادی شدہ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنا نکاح ہونے تک عفت و پاکدامنی کی زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> ﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ﴾ (النور:۳۳)
>
> ''اور جو لوگ نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔ اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے' اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔''

اسلام نے ایک جانب معاشرے کی تنظیم وتطہیر کی خاطر نکاح کی ترغیب دی تو دوسری جانب اس نے ناجائز طریقوں سے جنسی خواہش بھڑکانے کے تمام کام حرام قرار دیے' چنانچہ اس نے اختلاطِ مرد وزن' نامحرم عورتوں کے ساتھ خلوت' ہیجان انگیز تصویروں' فحش گانوں' مشکوک نگاہوں اور ان تمام چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا جو جنسی خواہش کو بھڑکاتی اور فحش کاری کی دعوت دیتی ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑲﴾ (النور)

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے' وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر طبریؒ رقمطراز ہیں :

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کے گروہ میں' جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے سچا عہد کیا ہے' زنا عام ہو' اور اس کی باتیں پھیلیں' ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ دنیا میں انہیں پاک دامن مَردوں اور عورتوں پر بہتان تراشی کے الزام میں دردناک سزا ملے گی اور اگر ان کا یہی رویہ برقرار رہا اور بغیر توبہ کے ان کی موت ہوگئی تو آخرت میں وہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔'' (۲۱)

اسلام نے خاندانی نظام کو بچانے کی غرض سے مندرجہ بالا آیت میں فحش پھیلانے والوں کے لیے دردناک سزا سنائی ہے' لیکن اس آیت میں زنا کو حرام نہیں کیا ہے' بلکہ حرمت کی تمہید باندھی ہے' کیوں کہ اسلام معاشرے کو نرمی اور سہولت کے ساتھ عفت اور پاک دامنی کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ زنا کی سزا کے احکام شراب کی حرمت کے مثل بتدریج نازل ہوئے ہیں (۲۲) اور آخر میں اعلان کر دیا گیا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ㉜﴾ (الاسراء)

''اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو' وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ ہے۔''

اور متعدد آیات کے ذریعہ اس برے کام کے ارتکاب پر سزا کی شدید دھمکی بھی دی ہے۔ اسی طرح سے زانی کے جرم کی سزا بتدریج نازل ہوئی ہے۔

ابتدائی اسلامی دور میں اگر عورت پر زنا کا جرم ثابت ہو جاتا تو اسے ایک گھر میں قید کر دیا جاتا اور وہ اس گھر سے موت تک نکل نہ سکتی تھی' جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮﴾ (النساء)

''تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو' یہاں تک کہ انہیں موت آجائے' یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔''

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جن عورتوں پر ارتکاب زنا کا جرم ثابت ہو جائے انہیں معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ آیت کے ٹکڑے ﴿اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مستقل اور قطعی حکم نہیں ہے' بلکہ ایک مخصوص وقفہ اور معاشرے کے مخصوص حالات کے لیے ہے' اور بعد میں اس سے متعلق مستقل فیصلہ صادر ہونے کی توقع ہے' چنانچہ بعد میں سورۃ النور میں دوسرا حکم نازل ہونے کے بعد یہ پہلے حکم کی تفسیر بن گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ﴿اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ②﴾ (النور)
>
> ''زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور چاہیے کہ ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود ہو۔''

یہ وہ راستہ ہے' جس کی طرف سورۃ النساء کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ (۲۳)

خلاصہ: معلوم ہوا کہ تفسیر القرآن بالقرآن ایک بنیادی اور بدیہی اصول مانا جاتا ہے' یہ سب کے یہاں تسلیم شدہ ہے' البتہ اس کے لوازمات و جزئیات میں اختلاف ہو سکتا ہے' جیسے نظم قرآن جو تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک جزء ہے' بعض لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر' محمد بن محمد ابوشھبة' مکتبة السنة القاهرة' ۱٤۰۸ھ' ص ٤٤۔
(۲) الاتقان فی علوم القرآن' علامہ جلا ل الدین السیوطیؒ' ج۲' ص ۳۱۔ ومناھل العرفان' ج۱' ص ٤۸۰۔ والتبیان فی علوم القرآن' ص٦۷'٦۸۔
(۳) البرھان فی علوم القرآن' بدر الدین زرکشی' ج۲' ص ۲۱۵۔
(٤) الاتقان فی علوم القرآن' علامہ سیوطی' ج۲' ص ۳۱۔
(٥) البرھان فی علوم القرآن' بدرالدین زرکشی' ج۲' ص ۲٦۱۔
(٦) اصول الفقه' عبد الوھاب خلّاف' ص۲۱۳۔
(۷) تاریخ تفسیر ومفسرین' غلام احمد حریری' ص ٤۱'٤۲۔
(۸) مسلم الثبوت' ج۱' ص ۳٦۱۔ وتاریخ تفسیر ومفسرین' غلام احمد حریری' ص ٤۳۔
(۹) اصول الفقه' عبدالوھاب خلّاف' ص ۲۲٦۔
(۱۰) تاریخ تفسیر ومفسرین' غلام احمد حریری' ص ٤۱۔ والتفسیر والمفسرون' ڈاکٹر حسین الذھبی' ج۱' ص ۳۸۔
(۱۱) ایضًا' ج۱' ص ۳۹۔ تاریخ التفسیر والمفسرون' غلام احمد حریری' ص ٤۳۔
(۱۲) التفسیر والمفسرون' ڈاکٹر حسین الذھبی' ج۱' ص ٤۱۔
(۱۳) فتح الباری' کتاب التفسیر' ابن حجر عسقلانی' ج۸' ص ٦٥۔
(۱٤) ایضاً' ج۸' ص ۱۸٦۔

(۱۵) نظرة عامة فی تاریخ التشریع الاسلامی، علی حسن عبد القادر، ج۱، ص ۱۶۳۔ وفتح الباری، کتاب التفسیر، ابن حجر عسقلانی، ج۸، ص ٦٥۔ التفسیر والمفسرون، ڈاکٹر حسین الذھبی، ج۱، ص ٤١۔

(۱٦) المذاھب الاسلامیة، گولڈ زیہر، ج۱، ص۱۰۔ والتفسیر والمفسرون، ڈاکٹر حسین الذھبی، ج۱، ص۱۔ وتاریخ تفسیر ومفسرین، غلام احمد حریری، ص۴۳۔

(۱۷) تاریخ تفسیر ومفسرین، غلام احمد حریری، ص ٤٤۔

(۱۸) التفسیر الکبیر، فخر الدین رازی، ج۱۰، ص ۱۰۸۔

(۱۹) سنن ابی داوٗد، کتاب الاشربة، باب العنب یعصر للخمر۔

(۲۰) تفہیم القرآن، ابوالاعلیٰ مودودی، ج۳، ص ۳۹۸۔

(۲۱) جامع البیان فی تفسیر القرآن، ابن جریر الطبری، ج۱۸، ص ۷۱۔

(۲۲) فقه السنة، سید سابق، ج۲، ۱ ص ٤٠٤۔

(۲۳) تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر، ج۱، ص ٤٧٢، ٤٧٣۔

* * *

بقیہ مضامین قرآن

اور سامنے کی جانب دوڑتا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اس نور کو پورا فرما دے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

بعد ازاں آیت ۱۰ تا ۱۲ میں خواتین کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ دین میں اپنے شوہروں کے تابع ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عائلی زندگی میں شوہر گھر کا نگران ہے اور بیوی کو اس کا فرمانبردار ہونا چاہیے، لیکن اللہ کے ہاں اس کو شوہر کی کسی نیکی کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، بلکہ اس کے کام اس کی اپنی نیکی ہی آئے گی۔ چنانچہ اس حوالے سے چند مثالیں دی گئی ہیں۔ پہلی مثال بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی ہیں کہ حضرات نوح ولوط علیہما السلام (جو اللہ کے رسول ہیں) کی بیویوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ جہنمی ہیں۔ دوسری مثال بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین و پاکیزہ خاتون کی ہے کہ فرعون (جو اللہ اور اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن تھا) کی بیوی حضرت آسیہ ایک جنتی خاتون ہیں۔ پھر حضرت مریم کی مثال دی گئی جو خود بھی نیک سیرت تھیں اور ان کی تربیت اللہ کے پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کی گود میں ہوئی۔ یہ مثال ہے "نورٌ علٰی نور" کی۔ یہ تو تین ممکنہ صورتیں ہو گئیں، جبکہ ایک چوتھی صورت بھی ہے کہ شوہر بھی بدترین اور بیوی بھی بدترین۔ اس کی مثال سورۃ اللھب میں بیان ہوئی ہے کہ ابولہب اور اُس کی بیوی اُمِّ جمیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کے باوجود دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے۔ یہ مثال ہے "ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ" کی۔

* * *

تعلیم و تعلّم

موجودہ درسی کتابوں کے نقائص

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی‘ حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کی درسی کتابیں ناقص ہیں اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی نشو ونما کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ایسے مغربی مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جن کا نقطۂ نظر کائنات اور انسان اور علم اور تعلیم کے متعلق‘ کم از کم جہاں تک ان کتابوں کی تالیف وتصنیف کا تعلق ہے‘ درست نہیں۔ ہم نے ان کتابوں کو سوچے سمجھے بغیر مغرب کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے اور ہر بات میں ان کی فوقیت کے دام میں مبتلا ہو کر اپنے ہاں نافذ کر رکھا ہے۔

مثلاً پہلے طبیعیاتی علوم کی درسی کتابوں کو لیجیے۔ ان علوم میں فزکس‘ کیمسٹری اور اسٹرانومی وغیرہ شامل ہیں اور ان سب کے لیے طبیعیات یا فزکس کا مختصر نام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان علوم کی درسی کتابوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کا مواد اس غلط مفروضہ یا عقیدہ پر مبنی ہے کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہم براہِ راست اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکتے ہوں۔ جو چیز ہم اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کر سکتے وہ یا تو موجود ہی نہیں یا پھر اگر موجود ہے تو اسے ہم جان نہیں سکتے‘ لہٰذا وہ معدوم کے حکم میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مفروضہ میں خدا اور خودی اور ان کی صفات کا انکار شامل ہے۔ لیکن اس مفروضہ کے غلط ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ یہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ فی الواقع صحیح ہے اور سچائی پر مبنی ہے تو ہم اسے ایک صداقت قرار نہیں دے سکتے‘ کیونکہ اس مفروضہ کو کسی شخص نے براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کیا‘ بلکہ یہ ایک عقیدہ یا مفروضہ ہے اور یہ مفروضہ اپنی تردید خود کر دیتا ہے۔ مغرب کے علماءِ طبیعیات اس مفروضہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ طبیعیات کو کسی ایسے عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیے جو سائنسی طریقوں سے یعنی براہِ راست حواسِ خمسہ کے مشاہدہ سے ثابت شدہ نہ ہو۔ لیکن ان کا یہ اصول خود ایک عقیدہ ہے جو سائنس کے طریقوں سے ثابت شدہ نہیں‘ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا عقیدہ پہلے موجود ہوتا ہے اور ان کی سائنسی تحقیق بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی سائنسی تحقیق اس عقیدہ کو ثابت نہیں کرتی‘ بلکہ ان کا یہ عقیدہ ان کی سائنسی تحقیق کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طرح سے جب مغربی مفکرِ مابعد الطبیعیات اپنی سائنسی تحقیق کو اس عقیدہ سے شروع کرتا ہے کہ سائنسی تحقیق کو کسی عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیے تو وہ اپنی تردید خود کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے کہ جس عقیدہ سے وہ اپنی سائنس شروع کرتا ہے وہ غلط ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے‘ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی سائنس دان اپنی سائنس کو ایک عقیدہ سے ہی شروع کرتا ہے‘ لیکن آخر مغرب کے سائنس دان یہ کہنے کے باوجود کہ سائنس کو کسی عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیے اس بات پر مجبور کیوں ہیں کہ اپنی سائنس کا آغاز ایک عقیدہ سے کریں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ

انسان فقط محبت کا ایک جذبہ ہے اور محبت کسی مقصود یا مطلوب کے عمدہ یا حسین ہونے کے عقیدہ کا دوسرا نام ہے' لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کا کوئی فعل ایسا بھی ہو جو کسی عقیدہ پر مبنی نہ ہو۔ مثلاً ہر فعل سے پہلے اس کا فاعل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا یہ فعل فلاں مقصد کو حاصل کرے گا اور اس کو انجام دینے کا فلاں طریقہ عمدہ اور حسین ہے۔ اور یہ عقیدہ اگرچہ معمولی سا نظر آتا ہے لیکن آخر کار حقیقت کائنات کے کسی تصور سے یا کسی نظریۂ زندگی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیق بھی چونکہ ایک انسانی فعل ہے' وہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور ممکن نہیں کہ وہ اس عقیدہ سے آغاز نہ کرے۔

یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ مغربی ماہرین طبیعیات کا یہ مفروضہ کہ صداقت وہی ہے جس کا مشاہدہ ہم براہِ راست حواسِ خمسہ سے کرتے ہیں' اگر سائنسی طریقوں سے ثابت شدہ نہیں تو پھر اس کی عقلی اور علمی بنیاد کیا ہے اور اسے کس بنا پر سائنسی تحقیق کا راہنما عقیدہ بنا دیا گیا ہے؟ حیرانی کی بات تو یہی ہے کہ اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور پھر بھی مغرب کے ماہرین طبیعیات نے اسے طبیعیات کی علمی اور عقلی جستجو کی راہنمائی کرنے والے ایک عقیدہ کا مقام دے دیا ہے۔ یہ مفروضہ دراصل بعض لوگوں کے گٹھ جوڑ کا باہمی سمجھوتہ تھا جو مذہب عیسائیت کی ضرورتوں اور مصلحت اور سیاست کے بعض تقاضوں کی بنا پر عمل میں لایا گیا تھا اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ سائنس اور سائنس دانوں کو کلیسا سے بچانے کے لیے بعض بہانوں سے خدا کے عقیدہ کو جو پہلے سائنس میں موجود تھا' سائنس سے خارج کر دیا جائے۔ مغرب کے علمی حلقوں میں بھی اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے سائنس کا مخصوص طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی وہ اسپین کے مسلمان تھے اور یہ لوگ سائنس کے موجد اس لیے بنے تھے کہ ان کے لیے قرآن حکیم کا ارشاد تھا کہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ کر کے خدا کو پہچانو! چنانچہ انہوں نے خدا کی معرفت کی جستجو میں مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور ان سے جو نتائج حاصل کیے ان کو ضبطِ تحریر میں لائے۔ آج ہم اسی قسم کے نتائج کو سائنس کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے ان پہلے سائنس دانوں کی سائنس خدا کے عقیدہ سے پیدا ہوئی تھی' لہٰذا خدا کا عقیدہ اس کا مدار و محور تھا۔ لیکن جب ہسپانوی مسلمانوں کے حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اسپین سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو پولوسیت (Paulism) یا جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین پاک اور مقدس ہے اور دنیا ناپاک اور غیر مقدس۔ لہٰذا سائنس جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے' دین سے الگ راستہ نکالتی ہے اور دین کو خراب کرتی ہے۔ لہٰذا اہلِ کلیسا نے سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا اور سائنس دانوں نے اپنا بچاؤ اسی میں سمجھا کہ سائنس سے خدا کا عقیدہ نکال کر اس کو ایک خالص دنیاوی اور پلید قسم کی کارروائی کا درجہ دے دیں تو پھر اس کے خلاف کلیسا کو شکایت کا موقع نہیں رہے گا۔

اسی اثنا میں کلیسا اور ریاست کے افتراق نے اسے ایک شدید سیاسی ضرورت بنا دیا' کیونکہ ممکن نہیں تھا کہ پوپ کے اثر و نفوذ کو سائنسی علوم اور مکتب کے چور دروازہ سے داخل ہو کر بادشاہ کے کام میں دخل انداز ہونے کی اجازت دی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی درسی کتابوں سے خدا کا عقیدہ خارج کر دیا گیا۔ سائنس کی بے خدائیت کو ایک علمی رواج اور فیشن کی شکل دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے سائنس دانوں اور فلسفیوں نے نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اپنے استدلال پر جبر کرنا شروع کر دیا اور قدرتی بے ساختہ اور معقول استدلال کے

جس راستہ پر انہیں خدا کا تصور دور سے سامنے نظر آتا وہ اپنے استدلال کو بزور اس راستہ سے ہٹا کر ایک اور راستہ پر ڈال دیتے تاکہ خدا کا تصور راستہ میں آنے نہ پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انیسویں صدی کے نظریۂ مادیت اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء ایسے سائنسی نظریات سائنس کی بے خدائیت کے رواج کے مطابق ڈھلنے لگے تو لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ یہ رواج ایک مذہبی عقیدہ پر اور ایک مصلحت اور سیاسی ضرورت پر مبنی ہے اور اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور غلطی سے یہ سمجھنے لگے کہ یہ سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے اور آج تک ایسا ہی سمجھا جاتا ہے' اگرچہ انیسویں صدی کی مادیت اور ڈارون کے میکانکی نظریۂ ارتقا کو بھی اب نئے حقائق نے روند ڈالا ہے۔ اگر حسّی صداقت کا مفروضہ مغربی سائنسدانوں کا کوئی علمی اصول ہوتا اور محض خدا کے عقیدہ کے خلاف ان کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ نہ ہوتا تو وہ ہر غیر حسّی صداقت کو مسترد کر دیتے' لیکن وہ اس اصول کو کام میں لا کر صرف خدا ہی کے تصور کو رد کرتے ہیں اور باقی ہر صداقت کو جو ثابت ہو سکے' خواہ وہ براہِ راست مشاہدہ میں آئے یا نہ آئے' قبول کرتے ہیں اور اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ مفروضہ غلط ہے۔ صداقت وہی نہیں جسے ہم براہِ راست اپنے مشاہدہ سے معلوم کریں' بلکہ وہ بھی ہے جسے ہم براہِ راست مشاہدہ سے تو معلوم نہ کر سکیں لیکن اس کے اثرات اور نتائج کو براہِ راست مشاہدہ سے معلوم کر سکیں۔ اس کی مثال ایٹم ہے۔ ایٹم کا جس قدر علم سائنسدانوں کو آج تک حاصل ہوا ہے' وہ اس کے براہِ راست مشاہدہ پر نہیں بلکہ اس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ پر اپنا دارومدار رکھتا ہے۔ خدا کا وجود بھی ایک ایسی ہی حقیقت ہے جس کا علم ہم اس کے براہِ راست مشاہدہ سے حاصل نہیں کرتے بلکہ مظاہر قدرت کی صورت میں اس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے سائنس دان ایٹم کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے ایٹم کو ایک سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں تو مظاہر قدرت میں خدا کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے خدا کو ایک سائنسی حقیقت کیوں نہیں سمجھتے؟ اس کی وجہ سائنس کی بے خدائیت کا وہی پرانا نامعقول رواج' خدا کے تصور سے وہی پرانا ڈر اور اس کے خلاف وہی پرانا تعصب ہے جو کلیسا کی سائنس دشمنی سے پیدا ہوا تھا۔

جس چیز نے طبیعیات کے علم کو ممکن بنایا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعیاتی مظاہر قدرت میں ایک نظم یا (order) پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نظم ایک ایٹم میں' ایک سالمہ میں' ایک کرسٹل میں' برف کے ایک گالہ میں' نظامِ شمسی میں' بلکہ ہر مادّی مظہر قدرت میں موجود ہے اور یہ نظم اس قدر جچا تلا ہے کہ ہم اسے ہمیشہ ریاضیاتی اعداد و رموز میں بیان کر سکتے ہیں۔ اس کنکری کی بڑھتی ہوئی رفتار بھی جو ایک اونچے مکان کی چھت سے نیچے گرائی گئی ہو اور لوہے کی اس سلاخ کی بڑھتی ہوئی طوالت بھی جسے گرم کیا جا رہا ہو ریاضیات کے ایسے اٹل قوانین سے مطابقت رکھتی ہے' جو کائنات میں اس وقت بھی اپنا کام کر رہے تھے جب ہنوز دنیا میں کوئی ریاضیات جاننے والا بلکہ کوئی انسان اور کوئی متنفّس بھی موجود نہ تھا۔ ان قوانین کو کس ذہن نے سوچا تھا؟ جدید طبیعیات کی تحقیق کے مطابق مادہ فنا ہو جاتا ہے اور اگر کائنات کو برقرار رکھتے ہوئے اسے رفتہ رفتہ کائنات سے نکال دیا جائے تو مادی مظاہر قدرت کے اندر جو چیز باقی رہ جائے گی وہ کچھ خیالی ڈھانچے اور کچھ ریاضیاتی نسبتیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لازوال اور اٹل ریاضیاتی نظم کو سوچنے والا ذہن ہی مادی مظاہر قدرت کی بنیادی حقیقت ہے۔ اگر ان میں یہ نظم موجود نہ ہوتا یا زمان و مکان کے لحاظ سے وہ ہر وقت اور ہر جگہ مسلسل اور یکساں نہ ہوتا تو طبیعیات کی سائنس

ممکن نہ ہوتی۔ ماہرِ طبیعیات کا کام یہی ہے کہ وہ ان مظاہرِ قدرت میں نظم دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے' اور جب کسی مظہرِ قدرت میں یہ نظم دریافت کر لیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس کی سائنس ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے' اور جب دریافت نہیں کر سکتا تو سمجھتا ہے کہ ابھی اس کی سائنس اس سمت میں ترقی نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قدرت میں نظم کی موجودگی کسی دارائے علم وحکمت اور اختیار وقدرت رکھنے والے ذہن یا شخصیت کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہے۔ اگر مکئی کے کچھ دانے سڑک پر بکھرے ہوئے ہوں تو آپ کہہ سکیں گے کہ شاید وہ سڑک پر جانے والے کسی چھکڑے سے اتفاقاً گر گئے ہیں۔ لیکن اگر وہی دانے ایک باقاعدہ ہشت پہلو ریاضیاتی شکل میں آراستہ ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ایسے ذہن کی تخلیق ہے جو ریاضیاتی انداز میں سوچ سکتا ہے اور حسن اور کمال کا ذوق رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی ایسے جنگل میں جا رہے ہوں جس کے متعلق یہ بات مشہور ہو کہ اس میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا اور آپ اچانک کسی خوبصورت جھونپڑی کے پاس آ نکلیں جس کے صحن میں سبزہ اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ذہن یا شخصیت کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس جنگل میں کبھی کوئی انسان نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ نظم کے اندر مقصد بھی شامل ہے' کیونکہ نظم کی تخلیق اور تکمیل خود ایک مقصد ہے اور مقصد ایک شخصیت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ طبیعیات کا محقّق اپنے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت سے نظم کی جستجو کر کے اور اسے دریافت کر کے یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ کس کا ذہن ہے اور یہ کون سی شخصیت ہے جس کی تخلیقی کارروائی اور مقصدیت مادی کائنات کے ذرہ ذرہ میں آشکار ہے؟ اس سوال کا عقلی اور علمی جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو تخلیق کی قدرت اور علم اور حکمت اور حسن اور کمال کی محبت کے اوصاف رکھتا ہے' اور چونکہ اس کا پیدا کیا ہوا نظم ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی رہتا ہے' لہٰذا خالقِ کائنات ایک ہی ہے۔ یہ سوال چونکہ طبیعیات کی درسی کتاب پیدا کرتی ہے اس کا جواب بھی درسی کتاب ہی کو دینا چاہیے' کسی اور کتاب کو نہیں۔ لیکن مغرب کا ماہرِ طبیعیات اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتا ہے بلکہ اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ اور اس کی وجہ وہی سائنس کی بے خدائیت کا نامعقول رواج ہے۔ لیکن ہمیں اس رواج کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم طبیعیاتی علوم کی درسی کتابوں کو نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ جہاں جہاں ہم نظم کے ثبوت پر پہنچیں وہاں اس نظم کو خالق کائنات کی تخلیقی کارروائی کی ایک شہادت کے طور پر بیان کریں اور اس کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیں' تاکہ طالب علم کے دل میں خدا کی محبت کا جوہر پیدا ہو اور اپنے کمال کو پہنچے۔

اب حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کی طرف آیئے۔ ان علوم میں زوآلوجی اور باٹونی وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔ ان علوم کی درسی کتابوں کا مواد بھی حسی صداقت کے نامعقول مفروضہ سے دبا ہوا ہے' حالانکہ حیاتیاتی مظاہرِ قدرت میں نظم اور مقصد کے اوصاف جو کسی خلاقِ علیم کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہوتے ہیں' مادی مظاہرِ قدرت سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک سیل (cell) یا خلیہ نظم اور مقصدیت کا حیرت انگیز شاہکار ہے۔ اسی طرح سے ایک زندہ جسم حیوانی اور اس کا ہر عضو' صرف آنکھ اور کان کی تخلیق میں علم'

حکمت اور قدرت کے جو کمالات بروئے کار آتے ہیں ان پر ایک بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایک زندہ جسم حیوانی کے اندرونی حیاتیاتی وظائف مثلاً عمل انہضام اور اس کی حیاتیاتی کیمیا‘ حیاتین اور ذناقین کی تیاری‘ دورانِ خون‘ سانس کی آمد و رفت‘ تناسل‘ ایک خاص طے شدہ جسمانی شکل کی جانب حیوان کی خود کارانہ نشوونما‘ اس کے اعضائے رئیسہ کا خود کارانہ عمل‘ زخموں کا خود بخود بھرنا اور بیماریوں کے خلاف صحت بحال کرنے والا خود بخود ظہور پذیر ہونے والا ردعمل ان میں سے ہر وظیفہ ثابت کرتا ہے کہ حیوان کی پیدائش اور نشوونما ایک ایسے ذہن کے قادرانہ اور حکیمانہ تصرف میں ہے جو خود حیوان کا ذہن نہیں‘ لہٰذا حیاتیات کی درسی کتابوں کا مواد بھی یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ ذہن کس کا ہے؟ اور اس سوال کا عقلی اور علمی جواب بھی یہی ہے کہ کسی قادرِ مطلق خالق کائنات کا! لیکن یہاں مغرب کا درسی کتاب لکھنے والا پھر اس سوال کے جواب میں خاموش رہتا ہے۔ وہ یا تو حیاتیاتی مظاہر قدرت میں نظم اور مقصد کی موجودگی بالکل تسلیم ہی نہیں کرتا یا اگر تسلیم کرتا ہے تو اس طرح سے کہ کسی خالق کائنات کا تصور اس کی درسی کتاب میں راہ نہ پا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ارتقاء کو جو خالق کائنات کی عالمگیر ربوبیت کا ایک شاندار اور یقین افروز مظہر ہے‘ قدرت کی بے جان اور بے مقصد میکانکی قوتوں کی اندھا دھند کارروائی کا اتفاقی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اگر اس کی بات کو صحیح مانا جائے تو یہ بھی طالب علم کو ماننا پڑتا ہے کہ اگر قدرت کی یہی بے بصر قوتیں کسی اور طرح سے کام کرنے لگ جائیں تو ممکن ہے کہ آج جو انسان ہے وہ انسان نہ ہوتا بلکہ گندگی میں رینگنے والا کوئی کریہہ المنظر کیڑا ہوتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کو خود نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ حیاتیاتی مظاہر قدرت کے اندر نظم اور مقصد کی تشریح کرتے ہوئے اسے خدا کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ قرار دیں اور ایسا کرنے کے لیے ہر موقعہ سے جو درسی کتاب کے مضمون کے اندر پیدا ہو‘ فائدہ اٹھائیں۔

نفسیاتی یا انسانی علوم میں مغرب سے مانگی ہوئی درسی کتابوں کے نقائص اور بھی زیادہ نمایاں اور افسوسناک ہیں۔ ان میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں‘ مثلاً فلسفۂ سیاست‘ فلسفۂ اخلاق‘ فلسفۂ اقتصادیات‘ فلسفۂ قانون‘ فلسفۂ تعلیم‘ فلسفۂ ہنر‘ فلسفۂ تاریخ‘ نفسیاتِ فرد اور نفسیاتِ جماعت وغیرہ۔ ان کو نفسیاتی علوم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی اعمال کے علوم ہیں اور انسانی اعمال کی جڑ انسان کی فطرت یا اس کی نفسیات میں ہے۔

مغرب میں یہ علوم محض بے ربط اور پراگندہ خیالات کے مجموعے ہیں اور ان کی حالت اس قدر خراب ہے کہ بعض مغربی حکماء ان کو علوم کے معزز نام سے یاد کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی حکماء کو انسان کی فطرت کا ہی علم نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ انسانی افعال کا سرچشمہ اور ان کا مقصد اور مدّعا کیا ہے۔ ان علوم کی خراب حالت کے متعلق خود کچھ کہنے کی بجائے میں آپ کے لیے مغرب کے ایک نامور ماہرِ نفسیات میکڈوگل کی کتاب ’’انتشارِ عالم‘‘ (World Chaos) سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں:

> ’’فطرتِ انسانی کے بارے میں ہماری لاعلمی اب تک تمام انسانی اور اجتماعی علوم کی ترقی کے لیے سدّ راہ بنتی رہی ہے اور اب بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک شدید ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ شاید مکمل تباہی کے شدید خطرہ کا سامنا کر رہی

> ہے۔ ہم علمِ نفسیات، علمِ اقتصادیات، علمِ سیاسیات، قانون، معاشرت اور اس کے علاوہ اور بہت سے فرضی علوم کا ذکر کرتے رہتے ہیں، لیکن سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دلکش نام فقط ہمارے علم کے خلاؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فقط ان کے وسیع و عریض بے آباد صحراؤں کی واضح نشاندہی کرتے ہیں جن کی سیاحت ابھی تک نہیں کی گئی۔ لیکن یہ صحراوہ ہیں کہ اگر ہماری تہذیب نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ان کو کسی قاعدے کے تحت لانا ہی پڑے گا۔ میرا اِدّعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے توازن کو بحال کرنے کے لیے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کا علم (منظم کیا ہوا، آراستہ کیا ہوا علم یا سائنسی علم) اس سے بہت زیادہ درکار ہے جو ہمیں اب تک حاصل ہوا ہے۔
>
> لہٰذا یہ ہے وہ ایک ہی طریق کار جس سے ہم اپنی تہذیب کو موجودہ غیر یقینی اور دن بدن زیادہ خطرناک ہونے والی حالت کا مداوا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انسانی اور اجتماعی علوم کو پوری کوشش کے ساتھ ترقی دے کر فطرتِ انسانی اور اس کی فعلیتوں کے سچ مچ کے علوم کی شکل دینی چاہیے۔ انسانی اور اجتماعی علوم کی بنیاد دریافت کرنے اور ان کے طریق ترتیب و تدوین کو بہم پہنچانے کی ضرورت آج اتنی شدید ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ تو پھر عملی نقطۂ نظر سے علاج کیا نکلا۔ میں اپنے جواب کو مختصر طور پر پیش کرنے کے لیے یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو کیا کرتا...... میں ہر ممکن طریق سے اس بات کی کوشش کرتا کہ ہمارے بہترین دماغوں کو طبیعیاتی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم میں تحقیق کے کام پر لگا دیا جائے۔" (انتشارِ عالم، صفحات ۹، ۵۹، ۱۱۲، ۱۱۵)

حکمائے مغرب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی فطری خواہشات میں سے ایک خواہش ایسی ہے جو اس کے تمام اعمال کی قوتِ محرکہ ہے، جو اس کی دوسری تمام خواہشات پر اور تمام اعمال پر حکمران ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے تمام سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، علمی، فنی، قانونی، جنگی اعمال اس خواہش کے مظاہر ہیں اور جب تک ہم اس خواہش کو نہ جانیں ہم ان اعمال میں سے کسی عمل کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا کوئی فلسفہ لکھ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکماء نے آج تک ان اعمال کے جو فلسفے لکھے ہیں وہ انسان کی اس خواہش کو جانے کے بغیر لکھے ہیں جو اس کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ فلسفے خود ان کو مطمئن نہ کر سکیں اور ان کے اپنے خیال کے مطابق بے ربط خیالات کے پلندے ہوں تو اس میں تعجب کی بات کوئی نہیں۔

مغرب کے حکماء کی نگاہ ابھی تک اس حقیقت پر نہیں پڑی کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ نصب العین کی محبت ہے جو فقط خدا کے نصب العین سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حسی صداقت کا مفروضہ ان کے آڑے آتا ہے اور وہ کسی ایسی صداقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ خدا کے تصور کو علم کے اندر لانے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ہمیں کون سی چیز مانع ہے کہ ہم ان انسانی اور اجتماعی علوم کی درسی کتابوں کو اس حقیقت کی روشنی میں نئے سرے سے لکھیں کہ خدا کی محبت انسان کے اعمال کی اصلی قوت محرکہ ہے اور جب ایک انسان خدا کو نہ جانتا یا نہ سمجھتا ہو تو وہ اپنے اس جذبۂ محبت کی تشفی کسی غلط نصب العین کی محبت سے کرتا ہے اور اس کی طرف خدا کی صفات منسوب کرتا ہے تا کہ اپنی غلطی کو مکمل کر کے اپنے اس جذبہ کی مکمل تشفی کا اہتمام کرے۔

* * *

تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام مجلّہ : ماہنامہ ''الحیات'' کا خصوصی شمارہ (داعی قرآن' داعی خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نمبر)
ضخامت : 432 صفحات' قیمت: 100 روپیہ
ملنے کا پتہ : مکتبہ الحیات' مدینہ چوک' گاؤ کدل' سری نگر' کشمیر

''الحیات'' سری نگر (کشمیر) سے نکلنے والا معروف دینی جریدہ ہے۔ زیر تبصرہ اس کا خصوصی شمارہ ہے جسے ''داعی قرآن و داعی خلافت۔ ڈاکٹر اسرار احمد نمبر'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک عظیم اسلامی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں انہیں فہم قرآن کی صلاحیت سے نوازا تھا وہاں ان کو گفتگو کا سلیقہ بھی ارزاں کیا تھا۔ ان کی گفتگو میں حد درجہ تاثیر ہوتی تھی۔ وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے موزوں ترین الفاظ استعمال کرتے تھے۔ قرآن کے ساتھ ان کو والہانہ لگاؤ تھا' تاہم وہ اس معاملے میں کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے مفسّر قرآن ہونے کے مدعی نہ تھے۔ قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ڈاکٹر صاحب کے فکر و عمل اور اخلاص سے متاثر ہونے والے لوگ ان کے مشن میں ان کے دست و بازو بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا مشن کیا تھا؟ بالفاظِ قرآن: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝٤٥﴾ (قٓ) چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے نظامِ خلافت کے قیام کی جدّ و جہد کا آغاز کیا اور اس جدّ و جہد میں لوگ ان کے ساتھی بنتے گئے اور تنظیم اسلامی کا قیامِ عمل میں آ گیا۔

ڈاکٹر صاحب ۱۳/ اور ۱۴/ اپریل ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کی خبر آناً فاناً دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ اخبارات و رسائل میں ڈاکٹر صاحب کی دینی اور ملی خدمات پر لوگوں نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

''الحیات'' کا زیر تبصرہ شمارہ ان ہی تحریروں کا ایک خوبصورت مرقّع ہے۔ یہ تحریریں مختلف عنوانات کے تحت ابواب میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ لکھنے والوں میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے معروف اور غیر معروف افراد شامل ہیں۔

ماہنامہ ''الحیات'' کی یہ خصوصی اشاعت ادارہ الحیات کے کارکنان کی اسلام اور نظامِ اسلام کے ساتھ خصوصی لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس کاوش پر ادارہ الحیات تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔

(۲)

نام کتاب : قرآن حکیم اور ہم

مصنف : ڈاکٹر اسرار احمد

ضخامت : ۴۹۶ صفحات، قیمت : اشاعت خاص (مجلد) 400 روپے، اشاعت عام (پیپر بیک) 250 روپے
ناشر: مکتبہ خدام القرآن، 36 کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گفتگو کا سلیقہ عطا کیا تھا، اس خداداد صلاحیت کو انہوں نے بھرپور استعمال کیا۔ قرآن حکیم کے ساتھ انہیں گہری وابستگی تھی۔ طالب علمی کے دور سے ہی انہوں نے درس قرآن کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کا درس کمال کی جامعیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان کے دروس کو حد درجہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ وہ جس موضوع پر بھی خطاب کرتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے خطابات کا مرکز و محور قرآن ہی ہوتا تھا۔ مختلف موضوعات پر اُن کے خطابات آڈیو/ویڈیو کیسٹس پر موجود ہیں، جو چھوٹے بڑے کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے آٹھ ہردلعزیز مقالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ مقالات خصوصی طور پر قرآن حکیم سے متعلق ہیں۔ ان مقالات کے قاری کو قرآن حکیم کی تعلیمات سے نہ صرف گہری واقفیت ہو جائے گی بلکہ عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوگا۔ کتاب میں شامل مقالات کے عنوانات اس طرح ہیں:

(۱) دنیا کی عظیم ترین نعمت — قرآن حکیم
(۲) عظمتِ قرآن بزبانِ قرآن وصاحبِ قرآن
(۳) قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر
(۴) تعارفِ قرآن مع عظمتِ قرآن
(۵) قرآن اور امنِ عالم
(۶) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
(۷) انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کے لیے قرآن کا لائحہ عمل
(۸) جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ

کتابوں اور کتابچوں کی صورت میں یہ مقالات ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکے ہیں۔ بعض کتابچے تو اس قدر مقبول ہوئے کہ کئی زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں اور لاکھوں لوگ ان سے ہدایت یاب ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم اسلامی تعلیمات کا اوّلین سرچشمہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن کریم کا فہم حاصل کرے۔ زیر نظر کتاب ''قرآن حکیم اور ہم'' اس مقصد کو پورا کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوگی۔

* * *

کاروباری اور ملازمت پیشہ افراد (مرد حضرات) کے لیے بنیادی دینی علوم سے آگاہی کا موقع

مرکزی انجمن خدام القرآن کے شعبۂ تدریس کے زیر اہتمام

17 ستمبر سے

فہم دین کورس

(موڈیول I اور II) کا آغاز ہو رہا ہے۔ (ان شاء اللہ)

نصاب (موڈیول I)

- عربی گرامر (تیسیر القرآن کے پہلے 20 اسباق)
- تجوید و ناظرہ
- مطالعہ حدیث (منتخب نصاب حدیث)
- ایمانیات

نصاب (موڈیول II)

- عربی گرامر (تیسیر القرآن کے آخری دس اسباق)
- ترجمہ قرآن مع عربی گرامر
- تجوید و حفظ
- توسیعی محاضرات (بنیادی اصطلاحات حدیث، قرآن فہمی کے اہم اصول اور مآخذ، دینی موضوعات پر لیکچرز)

دورانیہ: 4 ماہ **اوقات تدریس:** مغرب تا عشاء (سوموار تا جمعرات)

نوٹ:
موڈیول II میں داخلے کے لیے
موڈیول I کا پاس ہونا یا داخلہ ٹیسٹ
پاس کرنا لازمی ہے۔

داخلہ کے خواہشمند حضرات قرآن اکیڈمی K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور کے استقبالیہ سے داخلہ فارم حاصل کریں اور 17 ستمبر تک وہیں جمع کرا دیں۔

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی** K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 3-042-35869501، irts@tanzeem.org

نیشان دانش 0336-4205587
0333-4430391

بانیٔ تنظیم اسلامی و انجمن خدام القرآن

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کے بیانات پر مشتمل

4 اور 8 GB کے میموری کارڈز

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی

شاندار پیشکش!

4 GB میموری کارڈ **Rs.500**

- بیان القرآن، دورۂ ابو ظبہی، منتخب نصاب، خطبات رمضان، تلاوت مشاری راشد

فری ہوم ڈیلیوری
(صرف کراچی کے لیے)

8 GB میموری کارڈ **Rs.700**

- بیان القرآن، دورۂ ابو ظہبی، منتخب نصاب (تفصیلی)، دین کے تقاضے، خطبات ہند، منہجِ انقلابِ نبویؐ، خطباتِ خلافت، حقیقت و اقسامِ شرک، فتنۂ دجال، اسلام اور خواتین، خطباتِ رمضان، سائنس اور کلیسا کا تصادم، نجات کی راہ، تلاوت مشاری راشد ودیگر اہم خطبات

ملنے کا پتہ: قرآن اکیڈمی، خیابانِ راحت، درخشاں، اسٹریٹ 34، فیز 6، ڈیفنس، کراچی۔ فون: 24-35340022 (021)
گھر بیٹھے آن لائن خریداری کے لیے: store.QuranAcademy.com (یہ پیشکش صرف کراچی کے لیے ہے)

THE PROCESS OF CREATION

A QUR`ANIC PERSPECTIVE

(4)*

Original Text in Urdu by **Dr. Israr Ahmad**
Rendered into English by **Dr. Absar Ahmad**

THE INTELLECTUAL & SOCIAL EVOLUTION OF HUMANITY

According to a published paper of Dr. Rafi-ud-Din, referred to earlier in this monograph, the period from the creation of Adam down to the present day can be taken generally as the period of conceptual or ideological evolution. However, in all humility and modesty, I beg to differ from him here and dare to present a more analytical, detailed and deeper view of humanity's evolutionary process. I believe that the first stage of evolution consisted of purely physico-chemical changes and mutations. And the second level or stage of evolution, i.e. the biological evolutionary process, has already passed through two stages of evolution; while the third stage is presently under way.

In my estimation, the first stage of the human developmental ladder can be referred to as the phase of "intellectual evolution" the climax of which enabled man to transcend the limitations of physical/material existence and appreciate the ultimate ontological reality of the one true Lord, the Creator, on the basis of his own pristine pure nature and uncorrupted reason without the help of revealed knowledge and guidance. This indeed represents a major leap from the contingent and created beings to the affirmation of the existence and reality of the Creator and Initiator of the heavens and the cosmos. And this means not just the recognition of the one true Lord, rather it also means that, far from being earth-rooted or a person interested in immediate material gain here and now or taking blood relations as above all else, God becomes the ideal of all moral-devotional pursuits and developing rapport with Him is seen as the *summum bonum* or the highest moral/spiritual achievement leading to the eternal bliss and felicity.

Not obsessed with the material ephemera, the trivial and the immediate, he rejects all false demi-gods. This leap of faith brings him away from the maelstrom of daily life, suspending it. Calmness, resolute determination and peace characterize it. The monotheistic believer is led to think of the timelessness of God and the transience of life on earth making the Lord the ultimate object of his spiritual and moral endeavour. This indeed represents

---

*Part 3 was published in "Hikmat-e-Quran" July-September 2011. The temporal gap between the 3rd and the 4th (the last) instalment of translation is regretted. They will all be available, insha Allah, in the form of a booklet shortly. (*Editor*) the first evolutionary stage of the intellectual development of humans which achieved its highest zenith in the person of Abraham عليه السلام --- roughly after 5,000 years of the appearance of Adam عليه السلام.

The biographical details of the life and conduct of Abraham عليه السلام are highly telling. He lived among the Chaldeans who worshipped stars and other heavenly bodies. The ancestral idols were also worshipped and, in addition to this, the political ruler Nimrod was too believed to be invested with divine powers. Three verses of Surah *An`aam* (76-78), according to one interpretation, show the stages of reasoning through which Abraham passed and finally reached --- on the basis of rational human thought --- monotheistic belief in one God, the Creator. Some may argue here that Abraham’s reasoning only led to the negation and rejection of polytheism i.e. associating partners with God, whereas a positive insight into the unity of the Creator --- the true spiritual enlightenment --- is the result of divine grace. Nevertheless, the element of rational reasoning and argument is quite clear in Abraham’s dialogue with his father and idolatrous people and refuting them conclusively. The whole thrust of Abraham’s reasoning in verses 76-78 is directed against the superstitious beliefs of his people and demonstrate the folly of worshipping stars and other heavenly bodies. As such, his statements may be seen as premises of his arguments against polytheism and nature worship. The English translation of the verses reads:

> “So when the night darkened on him, he saw a star. He said: This is my Lord. But when it set, he said: I do not love the setting ones.”
> “So when he saw the moon rising, he said: This is my Lord. But when it set, he said: If my Lord had not guided me, I should certainly be among the people astrayed.”
> “When he saw the sun rising, he said: This is my Lord. This is the greatest. But when it set, he said: O my people! I quit that you associate (with Allah).”
> [6:76-78]

True knowledge shows that stars, sun and moon --- indeed all heavenly bodies --- rise and set according to laws whose author is Allah. What folly and how foolish to worship creatures, when we might turn to the one true God. Let us abjure all these follies and proclaim the one true God, argued Abraham. Thus, he expresses his final conclusion in these words:

> “Surely I have set my face towards Him who has created heavens and the earth, firmly and truly upright, and never shall I give partners to Allah.” [6:79]

This total and enthusiastic commitment to one Lord made Abraham عليه السلام place Allah at the forefront of his personal loyalties. Abraham, the iconoclast of the

Quran is the highest of the typical seminal religious figures and a staunch believer in the oneness of God. The monotheistic belief fully permeated his entire self and conduct and therefore the Quran rightly calls him a friend of God [*Khaleel Allah*; 4:125]. On the other hand, he was declared a leader (*imam*) for the entire humankind [2:124]. He was subjected by God to all trials of greatest magnitude and he failed in none of them. In every thing, Abraham علیہ السلام fulfilled Allah's wish and thus became the epitome of "*Islam*". As such, he fully deserved the promised leadership of the people for all times to come.

After the completion of intellectual evolution in the person of Abraham علیہ السلام, it was the right moment for the kick off of gradual human social evolution. In Abraham علیہ السلام, the monotheistic belief was internalized to the maximum degree as a result of which he became a paragon of the highest moral virtues like truthfulness, fidelity, affability and gentleness. Of course, this was all at the level of an individual's thought and behaviour. At this juncture of human history, however, the need of the hour was to externalize these moral virtues in human collectivities and corporate life. The society and the state, as a result of this, should fully reflect the Divine sovereignty and His universal providence and sustenance --- thus exemplifying God's attributes of "The Just" and "standing firm on justice" [3:18]. The Quran mentions three messengers --- Noah, Hud and Saleh علیہم السلام --- who came before Abraham علیہ السلام and contains extensive detail about the preaching of these probably all Arabian prophets. They were sent to wayward tribes in pre-Islamic times in regions that were, judging by clues in the Quran, close to locales and haunts fragmented by the contemporaries of Prophet Mohammad ﷺ. Prior to Abraham علیہ السلام, people generally indulged in only one error: the erroneous belief in polytheism, otherwise living a simple and moral life. The evils of civilization had not yet tainted their life and conduct. Therefore, the earlier messengers only focussed on the affirmation of *tawheed* (monotheism) and negation of *Shirk* (polytheism).

With Abraham علیہ السلام we see that human societies, going beyond the earlier simple lives, started showing all sorts of imbalances and moral turpitude. They indulged not only in all types of sexual perversion, but also exhibited social disruption through trade and monetary irregularities and worst economic and political exploitation. The civilizational divide between the strong and arrogant exploiters and the weak oppressed class surfaced for the first time in history. Therefore, Prophet Lut علیہ السلام was sent to Sodom and Gomorrah where the people of these two places indulged in the worst sexual perversion of homosexuality. The religious career of Shoaib علیہ السلام was concerned with morally reforming the malpractices of monetary plundering and looting rampant in and around Midyan (or Madain). Similarly, in its accounts of the Moses-Pharaoh confrontation, Moses علیہ السلام preaches pure monotheism to the Pharaoh and to the Egyptians; his mission is not restricted to the Israelites. Moses عليه السلام challenges and denies the divinity of the Pharaoh. Pharaoh claimed himself to be God --- not only one god among many but the only god: “I am your Lord Most High.” [79:24] Apart from that, for a king or ruler to make invidious distinction between his subjects, and especially to depress or oppress any particular class of his subjects, is a dereliction of his kingly duties, for which he is responsible to Allah. We read in verse 4 of Surah *Al-Qasas*:

> “Surely, Pharaoh exalted himself in the land and divided its people in groups, weakening a group among them, slaying their sons and letting their daughters live. Indeed, he was one of the mischief makers.” [28:4]

Pharaoh elated himself in the land and broke up its people into sections. He terribly brutalized and victimized the Israelites, subjecting them to the worst persecution and humiliation. All three Prophets --- Lut, Shoaib and Moses عليهم السلام --- succeeded in their mission only in the sense that their opposing and recalcitrant people were eliminated completely from the surface of the earth. However, none of them met success in the sense of transforming them in favour of the true monotheistic faith and piety. Moses عليه السلام, no doubt, went beyond the other two prophets in securing freedom and emancipation of his people (the Israelites) from the political yoke of Pharaoh and his savagery --- though it is a fact that Moses عليه السلام could accomplish all this only with special divine help and grace, through miracles and extra-natural events. But then, with the passage of time, Israelites touched the lowest moral and spiritual ebb by distorting the teachings of their prophets and by assigning too much weight to formal aspects of law instead of sticking to its substantial essence or core. Their political and religious leadership, both scholars and devout ascetics, exhibited the worst type of perverted mentality in limiting themselves to soulless rituals’ formal precision without the least regard for the inner spiritual kernel of devotional religious practices and modes of worship. Prophet Jesus made stern criticisms of their religious hypocrisy and sensitivity to formalism and legalistic niceties at the cost of utter disregard for the real significance and spirit of those commandments. Instead of paying heed to Jesus’ admonitions, the Jews tortured him and wanted to kill him by putting him on the cross. And as far as they were concerned, they did it but Allah’s decision prevailed over their planning as we read in the following verses:

> “That they said (in boast): We killed Christ Jesus, the son of Mary, the messenger of Allah. But they killed him not, nor crucified him. But so it was made to appear to them, and those who differ therein are full of doubts, with no (certain) knowledge, but only conjectures to follow. Surely they killed

> him not. Nay, Allah raised him up unto Himself; and Allah is Exalted in power, Wise.” [4:157-158]

The above lines vindicate that all prophets --- from Abraham عليه السلام down to Jesus عليه السلام --- fought against the social, economic and political iniquities, wayward and unscrupulous behaviour, wanton cruelty and oppression. But none attained concrete results in his prophetic career. It may be noted here parenthetically that Dawood عليه السلام and Sulaiman عليه السلام were, firstly, not prophets in the full connotation of the word. They were only *anmbia* or messengers. Secondly, their political leadership and monarchy in which justice and equity reigned supreme, was the result of divine grace and not at all the outcome of their prophetic missionary human endeavours. Indeed, both of them were divinely appointed kings and their justice-based kingly governance and leadership was a special gift of God, and not something achieved through human toil and labour.

It was after a long break consisting of 600 years since Prophet Esa عليه السلام (Jesus) that last of the prophets --- Prophet Muhammad صلى الله عليه وسلم --- was raised in Makkah and sent for the guidance of all humanity. Allama Iqbal, in his moving poetical lines, has very rightly characterized him as the climax and culmination of a very long evolutionary process:

> Of this varied world
> Thou art the meaning long sought
> Long sought by multitudes of men
> From every corner of the earth
>
> (*Ecstasy: Gabriel’s Wing*)

Indeed, Prophet Muhammad صلى الله عليه وسلم was the goal and objective of the entire evolutionary process of creation involving the variegated stages or the levels of the divine creative activity, reaching its apex in the person of Muhammad صلى الله عليه وسلم who established a socio-political order in Arabian Peninsula based on the sovereignty of the One Almighty, the Sustainer of all and His universal providence. The Prophet thus fully externalized and reified the Islamic monotheistic belief in the form of a polity and government thus establishing the ideal and perfect Khilafah (vicegerency) of Allah on earth. And this historical fact in principle completes the sociological evolution of humanity to its climax. As a digression it may be noted here that Allama Iqbal’s couplet:

> Your blessed appearance has realized the ideals of both inquisitive mind/reason and devotional love and anxiety-filled presence and togetherness

may refer to the blessed Prophet صلى الله عليه وسلم through whom both:

i. The potential of ordinary human beings; and

ii. Prophethood (prophets coming in a long chain starting from Adam عليه السلام and ending in Muhammad ﷺ)

reached the last highest pinnacle of evolution; the latter in the sense that he fully realized and successfully accomplished a most balanced and just polity based on the sovereignty of Allah, thus exemplifying the divine attribute of “standing firm on justice” [3:18] and fully realizing the objective of prophecy and revelation described in the words “… that mankind may uphold justice and equity” [57:25]. And the former in the sense that he established this system of social justice and equity through struggle on purely human level employing the strategy of a determined revolutionary leader confronting all odds and obstacles and going through all ordeals. This in itself vindicated the highest spiritual status and dignity of human beings. The struggle, endurance, sacrifice and perseverance of the Holy Prophet ﷺand his Companions رضی اللہ عنہم were really exemplary and proved beyond an iota of doubt that man is the apex and crème of Divine creation. Allah has imbued him with limitless potential and strength.

To sum up, the long chequered process of creation, passing through several stages of descent and evolution, finally reached its zenith in the form of “most perfect man” and “most perfect messenger” as exhibited in the person and prophetic career of Muhammad ﷺ. However, only one step in its full fruition yet remains to be taken.

The Prophet ﷺ, fourteen centuries ago, had achieved a great feat by establishing Islamic polity in the vast expanse of Arabian Peninsula: a great stride forward indeed in the socio-political evolution of humanity and indeed no mean achievement. But now this Arabian revolution has to be extended to encompass the entire globe so that the whole of humanity tastes the mercy and compassion of Islamic faith and weltanschauung (world-view). This, in fact, would be the last evolutionary stage towards which humanity is willy nilly moving slowly and gradually, because whatever gems of knowledge and wisdom and, in particular, positive goodness of higher social values it has, is due to the legacy of Prophet Muhammad ﷺ. All these can be traced back to him, emanating from his teachings enshrined in the Quran and the prophetic example. Humanity is engaged in seeking the ultimate realization of goodness in its search (though unawares!) of the Prophet’s guidance --- the climax of man’s long odyssey in search of truth and goodness. This was expressed beautifully in a couplet by Allama Iqbal thus:

> Wherever you see in the world of colour and scent
> Out of whose soil springs the plant of desire
> Is either already illumined by the light of Prophet Muhammad ﷺor
> Is still seeking and moving towards him (and his guidance)

It is, therefore, absolutely certain that humanity will definitely attain this last stage or plenitude of psycho-social evolution and the entire globe will witness the Islamic system of justice and equity fully implemented --- a sure proof and manifestation of Prophet Muhammad's ﷺuniversal mercy and compassion. There are strong and authentic Ahadiths in various collections of prophetic sayings which foretell the future corroborating this truth. I shall here mention two of these reports.

Imam Muslim رحمۃ اللہ علیہ has narrated, on the authority of Thauban رضی اللہ عنہ that Prophet Muhammad ﷺis reported to have said: "Almighty Allah folded up the whole earth for me (in a vision) so that I was able to see all the easts and all the wests, and surely the domination of my followers will be established over all those places that were shown to me by thus folding the earth".

According to an other tradition narrated by Imam Ahmad رحمۃ اللہ علیہ on the authority of Miqdad Ibn Aswad رضی اللہ عنہ, Prophet Muhammad ﷺis reported to have said: "There shall be no house on the entire earth, neither of bricks nor one made of camel's skin, but God will cause the word of Islam to enter it, either with the honour of one who deserves honour, or with the subjugation of the one who is defeated. That is to say, God will confer honour on some and they will embrace Islam, and He will cause the others to give up fighting and they will surrender before the rule of Islam." On hearing this, the reporter is on record to have uttered the words: "Thus will fulfil Allah's assertion "… and religion be wholly Allah's [8:39]." The Quranic word *deen* is, as is well known to all, a very comprehensive term. Its connotation implies the ideas of indebtedness, duty, obedience, judgment, justice, faith, religion, customary rites etc. So the real meaning is that everything (both individual probity and piety and collective socio-political behaviour) pays subservience to God's commandments given in Shariah which is supreme.

Indeed, if we ponder deeply, the major and minor premises of the Quranic argument also ratifies the belief of global domination of Islam and appears to be an impeccably logical conclusion. The following assertion of the Quran appears at three places in absolutely identical wording in surahs *Taubah*, *Al-Fath* and *As-Saff*:

> "It is He who sent His Messenger with guidance and the religion of truth (Islam) so that he may make it prevail over all religions….." [9:33, 48:28, 61:9]

This verse clearly and unambiguously states that the objective of the calling and mission of Prophet Muhammad ﷺwas to make Islam dominant over all man-made ideologies. Moreover, at five places in the Quran we read the statement that Prophet Muhammad ﷺhas been sent for the whole of humanity. The most clear and emphatic wording in this context occurs in verse 28 of Surah *Al-Saba*:

> "And We have not sent you except as a bearer of good news and a warner to all mankind….." [34:28]

The very fact that the Prophet ﷺ is a divine messenger for all humanity till the end of time necessitates logically that his prophetic mission would attain its climax and final victory only when Islam reigns supreme across the globe; thus vindicating the truth of the two above-mentioned Ahadiths. In a line of ode from *Gabriel's Wing* (excelling in sublimity of thought and its rapturous nature) Allama Iqbal's piercing glances can ruffle the moulds in which He manifests Himself and thus as a visionary has divulged the future scenario that lay in the womb of time:

The sky will shine mirror-like with the morning's light
And the might's darkness will be speeding away!
The hearts will again recall the message of prostrations
The foreheads will become acquainted with the Harem's dust
Whatever the eye is seeing cannot be described by the lips
I am lost in amazement as to what the world will become!
The night will eventually disappear by sun's appearance
This garden will be filled with the light of Tawheed!

However, here two points should clearly be kept in mind. Firstly, the global domination of Islam will be possible only as a result of immense sacrifice, endurance, resilience and fortitude of the believers having staunch Iman and commitment for executing the commands of Allah and His Messenger ﷺ. They will have to replicate the same enthusiasm and undertake similar gigantic struggle that the Prophet ﷺ and his Companions رضی اللہ عنہم showed against all odds in establishing the supremacy of Islam in Arabia. Secondly, before the final global victory of Islamists, Muslim Ummah will face Allah's wrath for its misdeeds and complacency. Deviation from the Right Path will incur terrible punishment from Allah the details of which are found in various chapters of Hadith collections, e.g. chapters of "*Fitan*", "*Genocidal Wars*" and "*Signs of the Last Hour*". However, after this chastisement, the light of Prophet Muhammad ﷺ will shine in its full exuberance all over the globe. Neither the Satan (or his acolytes from amongst humans and jinn) nor the most sophisticated and high-tech armament of the opposing forces will be able to check and thwart its global ascendancy.

And this will be the last stage of the psycho-social evolution of humanity immediately prior to the end or Doomsday. The entire cosmic heavens, which started off with the primeval "Big Bang" and continued to expand ever after, will be rolled back and brought to a naught, as we read in Surah *Al-Anbiya*:

> "The Day that We roll up the heavens like a scroll rolled up for books Even as We produced the first creation….." [21:104]

The world --- the universe --- as we know it, will be folded up like a scroll of parchment, for it will have done its work. And may be --- who knows! --- the Creator Who everyday is in a new splendour [55:29] will spread out and unfold a new chain of being. All we know with absolute certainty is:

> All that is on earth will perish: but will abide (forever) the face of thy Lord --- full of Majesty, Bounty and Honour.

(*Concluded*)

***

The treatise of Dr. Israr Ahmad “*Ejad o Ibda-e-Alam say Alami Nizam-e-Khilafat tak Tannazzul aur Irtiqa kay Marahil*”, the English translation of which under the title “The Process of Creation: A Quranic Perspective” is completed with this 4th part, was very much appreciated by a number of scholars and intellectuals who took the trouble to read it closely and thoughtfully. Among others, Dr. Munawar A. Anees, an internationally acclaimed critic and writer, referred to this tract as a major contribution in Cosmology. In his Iqbal Memorial Lecture given on July 05, 2012 under the auspices of Department of Philosophy, University of the Punjab, he presented the following lines to the audience in his published article:

> “… one of the eminent students of Iqbal, Dr. Israr Ahmad made remarkable interpretations of his philosophy with a unique blend of Quranic teachings and modern knowledge. **His short treatise on the origins and evolution makes him a man way ahead of his times.** Perhaps his work could serve as a precursor for an Islamic cosmology in congruence with the emerging thought as exemplified by biocentrism and biosemiotics.”

***

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

#

Aal-e-Imran

(Ayat 130-155)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ١٣٠

(130) O you who believe! Eat not usury doubled and multiplied, but fear Allah that you may be successful.

This subject has previously been mentioned in the *ayah* 275 of *surah Al-Baqarah* that was revealed in the ninth year of *Hijrah*, but this *ayah* being revealed in the third year of *Hijrah* makes it the first injunction concerning the prohibition of usury. In this *ayah*, Allah (SWT) prohibits His servants from usury from multiplying their capital by taking interest on it. And this is only possible if they have *Taqwa* of Him, so that they may achieve success in this world and in the Hereafter.

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ١٣١

(131) Fear the fire which is prepared for the unbelievers.

Allah (SWT) warns them of this punishment if they do not obey His commandments.

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ١٣٢

(132) And obey Allah and the Messenger; that you may obtain mercy.

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ١٣٣

(133) And hasten to the way (which leads to) forgiveness from your Lord, and for Paradise as wide as are the heavens and the earth, prepared for those who have Taqwa.

In these *ayaat*, Allah (SWT) commands His servants to obey Him and His Messenger (SAW) so that they might attain His mercy and forgiveness and the Paradise with its unimaginable vastness, prepared for such righteous persons.

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾

(134) Those who spend in prosperity and in adversity, who repress anger, and who pardon men Verily, Allah loves the good-doers.

This *ayah* describes the characteristics of the righteous persons mentioned above. They are those who spend in the way of Allah (SWT) only to attain His pleasure, both in hard times and in prosperity and they suppress their anger and forgive peoples' faults for His sake.

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ۥ
وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

(135) And those who, when they have committed indecency or wronged themselves with evil, remember Allah and seek forgiveness for their sins. And none can forgive sins but Allah. And do not persist in what they have done, while they know.

Allah (SWT) further describes their qualities that after having done an evil or having wronged their souls, they earnestly remember Allah (SWT) and seek forgiveness for their sins. And they know that it is only Allah (SWT) who can forgive their sins and they do not persist in the wrong they did after having repented from it.

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۙ﴿۱۳۶﴾

(136) For such, the reward is Forgiveness from their Lord, and Gardens with rivers flowing underneath, wherein they shall abide forever. How excellent is this reward for those who do good works.

i.e. those who do righteous deeds according to Allah’s commandments will get their just reward in the Hereafter.

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

(137) Many similar examples were faced by nations that have passed away before you, so travel through the earth, and see what was the end of those who disbelieved.

Allah (SWT) is encouraging the believers that if they face an adversity, they should not feel dejected or lose heart and should learn from the examples of the previous nations who believed in Allah (SWT) and followed His Messengers. They also faced similar hardships and suffering but Allah (SWT) helped them and made them triumph and destroyed their enemies.

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

(138) This is a declaration to mankind, a guidance and admonition to those who have Taqwa.

This *ayah* refers to the Holy *Qur’an.* Allah (SWT) states that it is a guide and admonition for all mankind and particularly for the pious.

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾

(139) Do not grieve and get disheartened, for you will have the upper hand if you are indeed believers.

Allah (SWT) commands the believers to take heart and not despair because of their partial setback suffered in the *Battle of Uhud.* He heartens them by giving them the good news that ultimately they will be triumphant and victory will be theirs if they truly believe in Him and obey His commandments.

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٠﴾

(140) If you have suffered from a wound be sure a similar wound has touched the others. And we alternate these vicissitudes among mankind so that Allah may know those who believe, and that He may take martyrs from among you. And Allah does not like the wrongdoers.

This means that as you have suffered heavy losses in men and material, so did the disbelievers. So do not grieve or be sad but have patience and be firm. Seventy of the Muslim army were martyred including the Prophet's Uncle *Hamza* (RAA) which was indeed a great loss. On the other hand, the *Quraysh* also suffered considerable casualties not only in the *Battle of Uhud* but also in the *Battle of Badr* but still they regrouped themselves and came back to fight. So why do you O Muslims lose heart by the loss suffered in the *Battle of Uhud. "And we alternate these vicissitudes among mankind so that Allah may know those who believe, and that He may take martyrs from among you."* i.e. Allah (SWT) sometimes allows the enemy to overcome the Muslims so that He may find out who are the real believers amongst them and those who give their lives as martyrs to seek His pleasure.

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾

(141) And that Allah may test the believers and destroy the disbelievers.

And that He may purify the faithful from sin and annihilate the infidels.

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾

(142) Do you think that you will enter Paradise before Allah tests those of you who fought (in His Cause) and tests those who are patient?

This *ayah* emphasizes the fact that every believer will have to go through the trials and the tests of faith in order to attain victory in this world and Paradise in the Hereafter. Even the previous nations were tried and tested with calamities and oppression from the disbelievers but ultimately the believers are always victorious. Therefore, the believers should always trust Allah (SWT) and His

Promise that He will surely destroy the disbelievers who commit oppression against them. But until then, the believers should persevere with patience in their trials because victory will only come after succeeding in tests and trials.

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾

(143) You did indeed wish for death before you met it. Now you have seen it openly with your own eyes.

This *ayah* refers to those Companions of the Prophet (SAW) who insisted on fighting the battle with the *Quraysh* army instead of staying behind and defending *Madinah*. They felt aggrieved at not having had the opportunity to fight in the *Battle of Badr* and thus longed for martyrdom. This *ayah* addresses them that you longed for death and wished to fight your enemy; now Allah (SWT) has given you that opportunity, so fight them and be patient.

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾

(144) Muhammad is no more than a Messenger, and indeed Messengers have passed away before him. If he dies or is killed, will you then turn back on your heels? And he who turns back on his heels, not the least harm will he do to Allah. And Allah will give reward to those who are grateful.

The Prophet (SAW) suffered severe injuries in the *Battle of Uhud*. At that time a rumour went up that Muhammad (SAW) had been killed. This made the Muslims lose heart and many of them began to turn away and did not actively participate in the battle. This is why Allah (SWT) revealed this *ayah* which states that if Muhammad (SAW) is killed while delivering His message, just like all the Messengers before him then will you O believers turn your back and not convey His message or defend your religion. *"And he who turns back on his heels, not the least harm will he do to Allah"* i.e. those who turn back to disbelief after they have believed should know that Allah's religion does not stand in their need. *"And Allah will give reward to those who are grateful."* i.e. those who remained steadfast and obeyed Allah (SWT) and His Messenger (SAW), will get their just reward. He that recants will do no harm to Allah but Allah will reward the thankful.

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٥﴾

(145) And no person can ever die except by Allah's Leave and at an appointed term. And whoever desires a reward in (this) world, We shall give him of it; and whoever desires a reward in the Hereafter, We shall give him thereof. And We shall reward the grateful.

This *ayah* encourages the Muslims to participate and engage actively in the battlefield and not abandon it for fear of death because doing so will neither increase nor decrease their life term as ordained by Allah (SWT). Therefore, they should spend it in Allah's cause and not for the sake of transitory enjoyments of this world which unfortunately is the situation regarding most of the Muslims today. *Salah* (prayer) which has been described as the criterion between faith and disbelief, how much does it feature in the life of the Muslims and how many of them are punctual in it? How many adhere to the other basic requirements of Islam such as *Fasting*, *Zakah* and *Hajj*? On the other hand, consider the prohibitions of Islam, how many Muslims indulge in these day and night and how many have adopted these as part of their lifestyle? This is because most of us struggle in life only for the enjoyments and luxuries of this earthly life and have forgotten the eternal joys of the next world. But Allah (SWT) says that those who are grateful to Him and appreciate His bounties will surely be rewarded for their good deeds in the Hereafter.

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

(146) And how many of the Prophets have fought (in Allah's Cause) and along with them (fought) large bands of religious learned men. But they never lost heart for that which did befall them in Allah's way, nor did they weaken nor degrade themselves. And Allah loves the patient ones.

This *ayah* teaches a lesson to the Muslims that as they have fought their enemies along with their Prophet (SAW), so did the Prophets before them along with their godly men. But what they suffered in Allah's cause did not make them lose heart and go back to disbelief. Instead, they obeyed Allah (SWT) and followed His Messengers. They neither weakened nor cringed abjectly. And Allah loves the steadfast.

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

(147) And they said nothing but: "Our Lord! Forgive us our sins and our transgressions, establish our feet firmly, and give us victory over the disbelieving folk."

This is the same prayer that Saul's army made to Allah (SWT) when they advanced towards the army of Goliath. It is mentioned in *ayah* 250 of *surah Al-Baqarah i.e. "Make us firm of foot and give us victory over the unbelievers".*

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

(148) So Allah gave them the reward of this world, and the excellent reward of the Hereafter. And Allah loves the good-doers.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

(149) O you who believe! If you obey those who disbelieve, they will send you back on your heels, and you will turn back (from Faith) as losers.

After the *Battle of Uhud*, some *Jews* and the hypocrites tried to seduce the believers to revert to disbelief. This *ayah* refers to them and Allah (SWT) warns the believers that these hypocrites want them to go back to disbelief after having faith, so do not obey them.

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾

(150) Nay, Allah is your Protector and He is the Best of helpers.

i.e. if you are sincere and steadfast in your faith, Allah (SWT) promises you His help and protection from the disbelievers. Allah is your protector. He is the best of helpers.

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾

(151) Soon we shall cast terror into the hearts of those who disbelieve, because they joined others in worship with Allah, for which He had sent no authority; their abode will be the fire and how evil is the abode of the wrongdoers.

In this *ayah*, Allah (SWT) gives the good news to the believers that He will cast fear of the Muslims into the hearts of the disbelievers. This is because the disbelievers disobey Allah's commandments and associate partners with Him. And a very painful punishment awaits them in the Hereafter as they serve other gods for whom no sanction has been revealed. Fire shall be their home; dismal indeed is the dwelling place of the evildoers.

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ
مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

(152) And Allah did indeed fulfill His Promise to you when you were killing them with His Permission until you lost your courage and fell to disputing about the order, and disobeyed after He showed you which you love. Among you are some that desire this world and some that desire the Hereafter. Then He made you flee from them, that He might test you. But surely, He forgave you, and Allah is Most Gracious to the believers.

This *ayah* refers to the *Battle of Uhud*. Allah (SWT) states that He fulfilled His promise to the Muslims that they will surely have an upper hand if they show patience and courage, which was indeed the case initially when the Muslims were winning the battle. But some of them lost their courage as Allah (SWT) says: *"until you lost your courage and fell to disputing about the order, and disobeyed after He showed you which you love."* This refers to the archers who were commanded by the Prophet (SAW) not to leave their appointed places. He instructed them, *"Stick* *to your place, and don't leave it even if you see birds snatching us, till I send for you; and if you see that we have defeated the infidels and made them flee, even then you should not leave your place till I send for you."* [19] But when they saw the disbelievers being defeated and fleeing towards the mountain, they wanted to join their victorious brothers and collect the booty. Their commander *Abdullah Bin Jubair* (RAA) commanded them not to leave their places but they disobeyed him and left their positions and that eventually became the cause of their defeat. It should be mentioned here that listening to and obeying Allah's Messenger (SAW) and his appointed *ameer* (commander) is obligatory on a Muslim whether it is pleasing or displeasing to him. The Arabic words for obedience and discipline are *Sama'a* and *Ta'at* i.e. to listen and to obey. The success of an Islamic movement lies in exhibiting the distinctive attitude of listen and obey i.e. obedience to Allah (SWT) and His Messenger (SAW) and to the one in authority from amongst them i.e. the *Ameer*. This last type of obedience is limited with two important conditions. First, the one in authority must be a Muslim and second, his commands must always be in accordance with the *Qur'an* and *Sunnah*. It has been narrated on the authority of *Abu Hurayrah* (RAA) that the Prophet (SAW) said: *"Whoever obeys me obeys Allah, and whoever disobeys me disobeys Allah . Who obeys the Ameer obeys me, and who disobeys the Ameer disobeys me."* [20] *"Among you are some that desire this world and some that desire the Hereafter. Then He made you flee from them, that He might test you."* When the disbelievers attacked the Muslims from behind, in utter confusion some of the Muslims turned back and fled from the battlefield. Thus Allah (SWT) says that He made their enemies overcome them, in order to test them. *"But surely, He forgave you, and Allah is Most Gracious to the believers."* i.e. He forgave those who fled from the battlefield and indeed He is gracious to the faithful.

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا
فَاتَکُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

(153)And remember when you were climbing up, without even casting a side glance at anyone, and the Messenger was in your rear calling you back. There did Allah give you one distress after another by way of requital to teach you not to grieve for that which had escaped you, nor for that which had befallen you. And Allah is well aware of all that you do.

When the archers guarding the valley behind the battlefront left their places, a group of the disbelievers' army led by *Khalid Bin Walid* (RAA) attacked the Muslims from behind which caused great confusion amongst Muslim warriors and they were soon surrounded by the army of the *Quraysh*. Then a rumor spread that the Prophet (SAW) had been killed. This news weakened the morale of the Muslims, so much so that some of the Muslims abandoned fighting and started climbing up the mountain to take refuge while the Prophet (SAW) was calling them to come back. Only a few of them, realizing that the Prophet (SAW) was alive, came back to the field and defended their Prophet (SAW). *"There did Allah (SWT) give you one distress after another by way of requital to teach you not to grieve for that which had escaped you, nor for that which had befallen you."* i.e. they felt grief over grief because of missing the war booty and triumph of their enemy and not because of their casualties and injuries.

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ
الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

(154) Then after the distress, He let peace fall upon you. A sleep overtook a party of you. While another party was thinking about themselves and thought wrongly of Allah - the thought of ignorance. They said, "Have we any say in the matter?" Say: "Indeed all matters belong wholly to Allah. They hide within themselves what they dare not reveal to you, saying: "If we had any say in the matter, none of us would have been killed here." Say: "Even if you had remained in your homes, those for whom death was decreed would certainly have gone forth to the place of their death." But that Allah might test what is in your breasts; and to purify that which was in your hearts (sins), and Allah is All-Knower of what is in the breasts.

While the Muslims were feeling the distress of the battle, Allah (SWT) sent down tranquility over them and they started to feel drowsy and because of that they felt calmness and enjoyed kindly sleep. *Abu Talhah* (RA) explains this strange sense of peace they had in these words: *"I was among those who were overcome by slumber during the battle of Uhud. My sword fell from my hands several times and I would pick it up, then it would fall and I would pick it up again."*[21] *"While another party was thinking about themselves and thought wrongly of Allah - the thought of ignorance."* This refers to the hypocrites. While Allah (SWT) sent down tranquility on the believers, the hypocrites were denied sleep thus increasing their distress and anxiety. Those hypocrites abandoned the battle and started to doubt the Prophethood of Muhammad (SAW) casting evil thoughts about Allah (SWT). They thought that the disbelievers would achieve victory and Islam and the Muslims would perish forever. *"They said, "Have we any say in the matter?" Say: "Indeed all matters belong wholly to Allah." They hide within themselves what they dare not reveal to you, saying: "If we had any say in the matter, none of us would have been killed here."* The hypocrites grumbled regarding their advice to remain in *Madinah* instead of coming to Mount *Uhud* where their friends and relatives had been killed. They started to murmur things like, 'Had it been thus and thus, we would not have lost our friend and families.' but Allah (SWT) states that the appointed destiny is fixed for everyone and when death approaches, no one can escape it. *" But that Allah might test what is in your breasts; and to purify that which was in your hearts (sins), and Allah is All-Knower of what is in the breasts."* Although Allah (SWT) knows even what is in your breasts but still He tests you to distinguish those who conceal hypocrisy in their hearts from the true believers. He has knowledge of your inmost thoughts.

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٥٥﴾

(155) *Those of you who turned back on the day the two hosts met, it was the Satan who caused them to backslide because of some (sins) they had earned. But Allah, indeed, has forgiven them. Surely, Allah is Oft-Forgiving, Most Forbearing.*

Some of the Companions (RAA) turned back from the battlefield in the hue and cry that was created when the disbeliever's army attacked the Muslims from behind. Allah (SWT) says that it was the Satan who made them slip and thus they failed to fulfill their duty. Satan made them err because of their previous faults; otherwise he could not have overcome them. One of the Companions who left the battlefield was *Uthman* (RAA). The enemies of the Companions take this as a reason to curse and hate *Uthman* (RAA) and other Companions of the Prophet (SAW), even though Allah (SWT) has said: *"But Allah, indeed, has forgiven them. Surely, Allah is Oft-Forgiving, Most Forbearing."*

End Notes

[19] Sahih Bukhari 4: 276.
[20] Sahih Muslim 6: 13.
[21] Fath-ul-Bari 7: 22.

***

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کے زیر اہتمام

داخلے جاری ہیں

(پارٹ I اور II)

رجوع الی القرآن کورسز

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I)

❶ عربی صرف ونحو
❷ ترجمۂ قرآن
❸ آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
❹ قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
❺ تجوید وناظرہ
❻ مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
❼ اصطلاحاتِ حدیث
❽ اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II)

❶ مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
❷ مجموعۂ حدیث
❸ فقہ
❹ اصولِ تفسیر
❺ اصولِ حدیث
❻ اصولِ فقہ
❼ عقیدہ
❽ عربی زبان وادب
❾ اضافی محاضرات

- اس سال کلاسز کا آغاز 3 ستمبر سے ہوگا
- داخلہ کے خواہشمند خواتین وحضرات یکم ستمبر کو صبح دس بجے انٹرویو کے لیے قرآن اکیڈمی تشریف لائیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

نوٹ:
پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 3-35869501
email:irts@tanzeem. org

ندیم سہیل
0322-4371473

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
July- Sep. 2012 Vol.31 No.3

مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن لاھور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ